جلد نمبر2
شمارہ نمبر4
جنوری 2020
المنار
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف
تبرّکات	القران، الحدیث
غالبِ خستہ کے بغیر	پرویز پروازی
غالب (احمد) مرگیا، پر یاد آتا ہے	ڈاکٹر ساجد علی
تعلیم الاسلام پرائمری سکول قادیان سے تعلیم الاسلام کالج ربوہ تک کا سفر	پروفیسر محمد شریف خان
ڈاکٹر عبد السلام اور چین	تحریر: پروفیسر ڈاکٹر پرویز بود بھائی ترجمہ: زکریا وِرک
ڈاکٹر صلاح الدین مرحوم	امتیاز راجیکی
میاں لطف الرحمن محمود صاحب (مرحوم) کا ذکرِ خیر	انجینئر محمود مجیب اصغر، ربوہ
شعری نشست	ناصر جمیل
From T.I. College Rabwah to University of the Punjab Lahore	Muhammad Zafrullah
Taking Down Terrorists in Court	William Finnegan,
سرورق اور پس ورق	تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی نئ عمارت

پتہ برائے خط و کتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ – الاعراف: 24

اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے

توبہ و استغفار کے یہ وہ کلمات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالی سے سیکھے تھے۔

شیطان نے جب اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو اس کے بعد نہ صرف وہ اس پر اڑ گیا، بلکہ اس کے جواز و اثبات میں عقلی و قیاسی دلائل بھی دینے لگا۔ نتیجتاً وہ راندہ درگاہ اور ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پایا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی پر ندامت و پریشانی کا اظہار اور بارگاہ الٰہی میں توبہ و استغفار کا اہتمام کیا، تو اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق قرار پائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پریشانی کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ

بخاری: الدعوات، باب الدعاء عند الکرب، الفتح ج ۱۱، ص ۱۲۳، مسلم: ۲۷۳۰

اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ عظمت والا اور بردبار ہے، اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ عرشِ عظیم کا رب ہے، اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ آسمانوں کا رب اور زمین کا رب اور عرشِ عظیم کا رب ہے۔
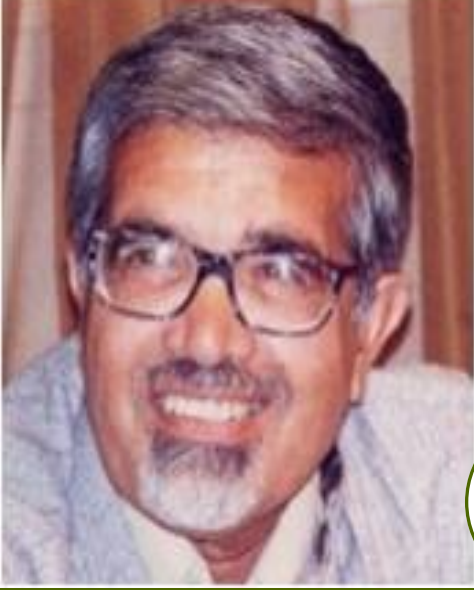
غالبِ خستہ کے بغیر

پرویز پروازی

راجہ غالب احمد بھی گئے۔ ان کے ساتھ گورنمنٹ کالج کے قیام پاکستان کے قریب کی ادبی روایت دم توڑ گئی۔ صوفی تبسم مرحوم کی سرپرستی میں گورنمنٹ کالج کے نوجوان دانشوروں کی جس جماعت نے ادبی حلقوں سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ ان میں مظفر علی سید تھے، غالب احمد اور انور غالب تھیں۔ حنیف رامے اور شاہین حنیف رامے تھیں، جاوید شاہین تھے۔ ان میں اکثر لوگ نفسیات کے لوگ تھے اور ادبی حلقوں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ غالب احمد مظفر علی سید کے ساتھ ایئر فورس میں چلے گئے اور مدتوں اپنے نام کے ساتھ فلائٹ لیفٹیننٹ غالب احمد لکھتے رہے۔ حنیف رامے سیاست میں آکر خوار ہوئے اور اپنی رہی سہی آبرو بھی گنوا بیٹھے۔ غالب احمد غالباً اس گروپ کے آخری آدمی تھے وہ بھی راہی بقا ہوئے۔ جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے۔ جاوید شاہین نے اپنی خودنوشت "میرے ماہ وسال" میں مزے لے لے کر صوفی صاحب اور ان کے پروردہ نوجوانوں کے گروپ اور ان کی صوفی صاحب کی سرپرستی میں ہونے والی "زائد از نصاب" سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

ہمارا اور غالب احمد کا تعارف اس زمانہ میں ہوا جب وہ لاہور کے سکینڈری ایجوکیشن بورڈ کے کنٹرولر امتحانات بن کر لاہور آگئے۔ ہمیں کسی میٹنگ میں

شرکت کرنا تھی جس کی صدارت غالب احمد کر رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے میں بھی تعلیم الاسلام کالج کا اولڈ سٹوڈنٹ ہوں۔ بس باہمی اشتراک نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا پھر ادبی سطح پر یہ اشتراک بڑھتا گیا۔ غالب احمد سرگودھے آگئے تو ربوہ سے قربت کی وجہ سے ان کا ربوہ آنا جانا بھی بڑھ گیا اور ہماری ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ ہمارا کالج ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے سارے ملک میں ممتاز تھا۔ ہر مہینے بلکہ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی ادبی تقریب برپا ہوتی رہتی۔ سرگودھے کے دیگر ادبا کی طرح غالب احمد شرکت کرتے۔

دسمبر میں جماعت احمدیہ کا جلسہ سالانہ بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا کرتا تھا۔ میں اپنے گھر پر اس موقع پر ایک مشاعرہ منعقد کیا کرتا تھا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے شعرا شرکت کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مشاعرہ کا واقعہ ہے کہ میری ہمیشرہ نسبتی (اب ڈاکٹر امتہ النصیر) جس کی عمر اس وقت کوئی دس برس ہو گی۔ بڑھ چڑھ کر مشاعرہ کے انتظامات میں حصہ لے رہی تھی کیونکہ اس نے سنا تھا کہ غالب بھی مشاعرہ میں شرکت کر رہے ہیں۔ جب شعرا اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور مشاعرہ شروع ہوا تو دروازے سے لگ کر بیٹھ گئی اور غور سے مشاعرہ سننے لگی۔ غالب احمد کی باری آئی اس نے ان کا کلام سنا اور اپنی بہن یعنی میری بیوی سے کہنے لگی "ہائے اللہ یہ غالب نے داڑھی کیوں اتر ادی ہے۔ تصویر میں تو بہت خوبصورت لگتا تھا"۔ وہ غالب احمد کو مرزا غالب سمجھ بیٹھی تھی۔ ہم نے غالب احمد کو یہ بات سنائی۔ غالباً اس کے بعد غالب احمد نے بھی داڑھی چھوڑ دی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!۔

انتظار حسین نے اپنی خود نوشت "چراغوں کو دھواں" میں لکھا ہے "بھٹو صاحب ویسے تو بہت دانا و بینا تھے مگر اسلام کا علم بلند کرتے وقت اس نکتہ کو فراموش کر گئے۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام، جمعہ کی چھٹی، گھڑ دوڑ، پابندی شراب پر پابندی مگر عجب ہوا کہ ایسے کام انجام دینے کے باوجود ان کی مسلمانی مشکوک رہی۔ ہاں یہ جو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام تھا اس کا تھوڑا اثر ہماری دوستیوں پر بھی پڑا۔ غالب احمد کو کب سے مسلمان سمجھتا چلا آرہا تھا اچانک پتہ چلا کہ وہ تو غیر مسلم ہے۔ مجھے تو خیر جانے دو ہمارے دوستوں کے حلقہ میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تو اپنے شیخ صلاح الدین چلے آرہے تھے۔ ان کے دو ہی تو محبوب موضوعات تھے وقت کا مسئلہ اور اسلام۔ انہوں نے اسلام کے پیچ سے کیسا کیسا فلسفہ کشید کر کے ہمارے ذہن نشین کیا تھا مگر حیف کہ غالب احمد کی نامسلمانی ان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اس انکشاف کی سعادت ہمارے سیکولر رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی۔ خیر دوستی تو نبھانی تھی۔ کتنے زمانے سے اس یار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں نے سوچا آئین دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ اب جبکہ دوست مسلم سے غیر مسلم بن گیا ہے تو اس حادثے پر اس سے جا کر اظہار ہمدردی کیا جائے یا تعزیت کی جائے۔ میرے ہوتے ہوئے میرے سوا جو دوسرا دوست غالب احمد سے تعزیت کرنے آیا تھا وہ حیات احمد خان تھے"۔ (چراغوں کا دھواں صفحہ -264 65)۔

پھر انتظار حسین نے اپنی دوسری خود نوشت "جستجو کیا ہے" میں لکھا "ان خوابوں نے یا اس خواب نے ان دنوں جا کر رنگ پکڑا جب میں لاہور شہر میں رچ بس چکا تھا اور چھوڑی ہوئی بستی خواب و خیال بن چکی تھی۔ ناصر کاظمی کے ساتھ جو شب و روز بسر ہوئے یہ ان کا فیض تھا۔ ان دنوں ناصر کے نہیں یاروں کی پوری منڈلی کے ساتھ اس شہر میں اتنا گھوما پھرا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ سڑک سڑک سمجھ بیٹھا کہ ناصر کے ساتھ میں بھی اس شہر کا روڑا بن چکا ہوں۔ سو اب اپنی چھوڑی ہوئی بستی کی گلیاں کوچے بھی کم کم یاد آتے تھے مگر خوابوں میں تو وہ اب زیادہ ہی آنے لگے تھے۔ شاید انہوں نے لاہور کے گلی کوچوں میں رچتا بستا دیکھ کر میرے بیدار شعور سے پسپا ہو کر میرے خوابوں میں پناہ لے لی تھی۔ شاید میرے اندر وہ چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور مجھے نیند میں غافل پا کر مجھے یاد دلانے آتے تھے کہ نیا دیار نئے کوچے برحق مگر ہم بھی یہیں کہیں تمہاری یادوں میں شاد آباد ہیں۔

وہ راتیں بھی خوب تھیں۔ گھومتے پھرتے رات زیادہ ہو جاتی تو کوئی یہ سوچ کہ گھر دور ہے ہمارے رات کے کسی ہم سفر کے ہمراہ اس کے گھر جا پسر تا۔ کسی ایسی ہی شبھ گھڑی میں غالب احمد میرے ٹھکانے پر آگیا۔ تنہائی میں دل کی باتیں کہنے کا موقع ملا تو میں نے یہ سوچ کر کہ غالب کا مضمون نفسیات ہے اسے اپنے خوابوں کی نوعیت بتائی۔ سوچا کہ وہ اس کی معنویت پر کچھ روشنی

ڈالے گا مگر اس نے کچھ اور ہی بات کی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے ایک سوال کر ڈالا" تم نے کافکا کا ناول کیسل پڑھا ہے ؟"۔

"نہیں" میں کہا" بس میں نے اس کا ایک ہی ناول پڑھا ہے ٹرائل اور کچھ کہانیاں"

"اس ناول کو پڑھ لو"

میں نے اس مشورہ کی وضاحت چاہی۔ جواب دیا" بس تم یہ ناول پڑھ لو"۔

۔۔۔ پڑھا۔۔۔ میں حیران کہ یہ میں ناول پڑھ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں ارے یہ تو میں خود اپنے خوابوں کے بیچ بھٹک رہا ہوں" (جستجو کیا ہے صفحہ 17-18)

غالب احمد ادب کے میدان میں اتنے مصروف نہیں رہے جتنی ان کی بیگم انور غالب رہیں۔ انور نثری نظم کی جدید ترین صنف سخن کی ایک لحاظ سے بانی تھیں مگر اپنی گوشہ نشینی کی وجہ سے کم ہی سامنے آتی تھیں۔ غالب خود بھی پختہ کار غزل گو تھے مگر ان کا رجحان بھی چھپنے کی طرف نہیں تھا۔ دونوں کا کوئی مجموعہ کلام چھپا ہو تو میرے علم میں نہیں۔ ہاں غالب احمد کی ادبی بصیرت کا ایک منظر میرا آنکھوں دیکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب تخلیقی عمل چھپی تو ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی مگر کہیں کہیں سے اس کتاب کے مندرجات پر تنقید و تنقیص کی آوازیں بھی اٹھیں۔

کشور ناہید نے اپنے دولت خانہ پر ایک ادبی مکالمہ کا اہتمام کیا۔ آغا صاحب سرگودھے سے پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو اور ربوہ سے مجھ جیسے ہیچمداں کو لے کر لاہور آئے اور ہم کشور ناہید کے ہاں حاضر ہوئے۔ کشور نے لاہور سے جناب جیلانی کامران، اور غالب احمد کو مدعو کر رکھا تھا۔ ایسی مکالماتی نشست میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھی جس میں مدعوئین نے ایک دوسرے کے نظریات اور خیالات پورے تحمل اور بردباری سے سنے ہوں اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہو۔

چار پانچ گھنٹے تک یہ نشست جاری رہی غالباً کشور ناہید نے اسے ریکارڈ بھی کیا تھا شاید اس کی روداد کہیں چھپی بھی ہو مگر میرے علم میں نہیں۔ اس نشست میں غالب احمد نے جس بالغ نظری سے کتاب کے مالہ اور ماعلیہ پر بحث کی تھی وہ ادب میں یادگار رہنے والی چیز ہے۔ اس نشست میں شامل ہونے والے ہر ایک شخص نے غالب احمد کو داد دی تھی اور وہ حسب طبیعت سر جھکائے بیٹھے رہے۔

غالب احمد سرگودہا بورڈ کے چیئرمین بنے وہاں سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین بن کر لاہور آ گئے پھر جائنٹ سیکرٹری ایجوکیشن کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ وظیفہ یابی کے بعد سارا وقت جماعت احمدیہ لاہور کے ترجمان رہے۔ 28 مئی کے حادثہ کے بعد جس میں لاہور کی احمدیہ مساجد پر حملے کر کے کوئی سو کے قریب احمدیوں کو شہید کیا گیا تھا یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا اور راجہ غالب احمد نے اس کام کو خوب نبھایا۔

پچھلے دو تین برسوں سے ان کی طبیعت ناساز تھی خاص طور پر انور غالب کی وفات کے بعد تو بہت ہی اداس اور پریشان رہنے لگے تھے۔ پچھلے جمعہ کو لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ربوہ میں بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

(راجہ غالب احمد کا شعری مجموعہ "رخت ہنر" کے نام سے نیازمانہ پبلیکشنز ،لاہور-پاکستان سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریب رونمائی میں انتظار حسین نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ایڈیٹر نیازمانہ)

(بشکریہ نیازمانہ)

غالب (احمد) مرگیا، پر یاد آتا ہے

ڈاکٹر ساجد علی

فیس بک پر محترم مسعود اشعر صاحب کے کالم سے یہ افسوسناک خبر ملی کہ غالب احمد بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کے نوٹ سے اور بھی دکھ ہوا کہ اخبار نے غالب احمد کے ذکر کی بنا پر اس کالم کو لائق اشاعت نہ جانا۔ ہماری یہ روایت تو نہیں کہ شعر و ادب کی داد دینے سے پہلے شاعر یا ادیب کا عقیدہ دریافت کیا جائے۔ شاعر کا تو ہمیشہ سے یہ امتیاز رہا ہے کہ اسے ہر طرح کی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر حضرات اکثر مذہبی شعار اور اداروں کا مذاق اڑاتے رہے ہیں مگر کبھی اس بات پر نہ لائق نفرین ٹھہرائے گئے نہ گردن زدنی۔ اگر کسی نے شاعرانہ اظہار کو فقہ کی سان پر پرکھنے کی کوشش کی تو الٹا اسے بدذوق قرار دیا گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کسی مفتی شرع متین نے اس شعر پر میر صاحب کی گرفت کی ہو:

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غالب کی رند مشربی اور آج کے 'علمائے حق' کی رو سے بدعقیدگی کے باوجود نہ صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ نے اس سے قطع تعلق کیا نہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے منہ موڑا بلکہ دیوان غالب کے انتخاب کا فریضہ بھی انجام دیا جس میں یہ شعر بھی موجود تھا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

خود مفتی آزردہ صاحب نے غالب کی صحبت کا اثر قبول کرتے ہوئے تمام تر تفقہ اور تقویٰ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس قسم کا لازوال شعر بھی کہہ دیا:

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں مہاتما بدھ کو خراج تحسین پیش کیا، رام کی تعریف میں نظم لکھی، گایتری کے اشلوک کا ترجمہ کیا، بابا گورونانک کو مرد حق قرار دیا، سوامی رام تیرتھ کا مرثیہ کہا۔ ایک مولوی صاحب نے اس پر کفر کا فتویٰ ارشاد کیا تو اسے سید سلیمان ندوی سے لے کر ظفر علی خاں تک نے ملامت کا ہدف ٹھہرایا۔ علامہ اقبال نے تو مزید ستم یہ کیا کہ احمدیوں کے خلاف مضمون لکھنے کے باوجود اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کا نام اپنے بچوں کے گارڈین میں شامل

کیا۔

انتظار حسین صاحب، جنہیں مرحوم لکھنے کو دل نہیں مانتا، کا کہنا تھا کہ اردو میں عظیم کا لفظ صرف تین لوگوں کے نام کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور وہی درحقیقت اس کے حق دار ہیں۔ اور وہ تین نام میر، غالب اور اقبال ہیں۔ لیکن اگر راسخ الاعتقادی کو معیار بنایا گیا تو پھر ہمیں ان سب سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ہمارے ایک بہت بڑے نقاد تھے جن کا نام محمد حسن عسکری تھا۔ جوانی میں، ترقی پسندوں کے بقول، زوال آمادہ اور فراریت سے معمور فرانسیسی ادب سے متاثر تھے اور اسی انداز میں کہانیاں بھی لکھتے تھے۔ شاعری میں فراق گورکھپوری کے مداح اور عقیدت مند تھے، اقبال کی شاعری کو کسی شمار قطار میں نہیں رکھتے تھے۔ جوانی کے بعد رینے گینوں کی معرفت مذہب کی طرف مائل ہوئے تو اشرف علی تھانوی صاحب سے رشتہ عقیدت استوار کیا اور مفتی شفیع صاحب کی تفسیر کے انگریزی ترجمہ میں مشغول ہو گئے۔ اس کایا کلپ کے باوجود فراق سے ان کی عقیدت میں کوئی فرق نہ آیا اور فراق کی شاعری کے متعلق انہوں نے اپنی آرا میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی اور نہ علمائے دیوبند نے ان سے ایسا کوئی مطالبہ کیا۔

جدید دور میں جب کہ تعلیم کو عام کیا جا رہا ہے تو نصابات میں شعر و ادب کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ تو کیا کسی ادیب اور شاعر کو نصاب میں شامل کرنے سے پہلے اس کے عقاید کا جائزہ لیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میر اور غالب سمیت کتنے ہی شعرائے کرام کو تعلیمی اداروں کے نصاب سے خارج کرنا پڑے گا۔ کیا اقبال کو نصاب سے خارج کر کے ہمیں اقبال سہیل صاحب کی شاعری کو پڑھانا پڑے گا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ساہیوال میں ایک مذہبی مدرسہ ہے۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنے رسالے کا مدنی نمبر چھاپا۔ لا محالہ اس میں مولانا مدنی اور اقبال کے اس مباحثے کا ذکر بھی آنا تھا۔ اس زمانے میں اقبال سہیل صاحب نے اقبال کے اس مشہور قطعے کا جواب ایک طویل نظم کی صورت میں دیا تھا۔ رسالے کے مدیر نے اس نظم کو شامل اشاعت کرتے ہوئے اس پر یہ نوٹ لکھا تھا کہ اقبال سہیل صاحب کا شعری مقام ڈاکٹر اقبال سے بہت بلند ہے۔ اس تنقیدی بصیرت پر اہل مذہب ہی سبحان اللہ کہہ سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد سے لے کر انتظار حسین تک کتنے ہی نثر نگاروں کی تحریروں کا مطالعہ باعث جرم و سزا شمار کیا جائے گا۔ نہ دیا شنکر نسیم کے لیے کوئی جگہ ہوگی نہ منشی پریم چند کے لیے۔ فراق گورکھپوری تو مذہبی عقائد کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ کی بنا پر مردود نصاب ہوں گے۔

خیر بات ذرا پھیل گئی۔ میں لکھنا تو غالب احمد صاحب کے بارے میں چاہتا تھا جن سے شناسائی رہی اور کچھ ملاقاتوں کا موقع میسر آیا۔ زمانہ طالب علمی میں ناصر کاظمی کے فرزند، باصر سلطان کاظمی، سے دوستی کا آغاز ہوا تو ایک دوبار ناصر کاظمی صاحب کو دیکھنے کا موقع میسر آیا، لیکن ناصر کاظمی کی وفات کے بعد باصر کے گھر پر اور اس کے ساتھ ناصر کاظمی کے دوستوں سے ملنے کے کتنے ہی مواقع میسر آئے۔ انہیں میں غالب احمد صاحب بھی تھے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ناصر کاظمی ہجرت کر کے ایک بار پھر لاہور میں وارد ہوئے تو ان کے گرد کچھ لوگوں کی منڈلی جمع ہوئی جو ناصر کی سحر انگیز شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ان شب گزیدوں کی انجمن کا ایک رکن غالب احمد بھی تھے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھے۔ وہ ناصر کے کتنے ہی رتجگوں کے رفیق تھے۔ 16 دسمبر 1951 کو ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "غالب احمد ان دنوں میری تنہائیوں اور رتجگوں میں زیادہ شریک رہتا ہے۔" ڈائری کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غالب احمد کی تخلیقی اور شعری صلاحیتوں کے متعلق بہت پر امید تھے۔ 27 فروری 52 کو لکھا ہے: "ایک شعر غالب احمد کا نقل کرتا ہوں، بہت پسند آیا:

آنکھ چمکی کرن کرن کے ساتھ
شہر سے دور دن کا پھول کھلا

ازاں بعد ایک اور اندراج کچھ یوں ہے: "20 ستمبر 52۔۔۔ غالب احمد ابھی ابھی گجرات سے آیا۔ نشست رہی۔ اس سے غزل سنی، ساری غزل پسند آئی۔

پھر اٹھا جانب دل شور کہیں
آرزوؤں نے کیا زور کہیں

دور اس پار چمک لہرائی
پھر گھٹا اٹھی ہے گھنگھور کہیں
کون جانے یہ کہاں برسے گی
یہ برستی ہے کہیں شور کہیں
جنگلوں میں بھی تو آبادی ہے
من میں رہتا ہے وہ چت چور کہیں
چشم نرگس بھی ہوئی دیدہ شوق
کاش آجائے وہ اس اور کہیں

غالب احمد کی اس غزل میں مطلع کے دوسرے مصرع میں آرزوؤں کی زاور اور زور۔ پھر دوسرے شعر میں گھٹا اور گھنگھور کی آواز، پھر یہ مصرع، یہ برستی ہے کہیں شور کہیں۔۔۔ مون سون اسی طرح اٹھتی ہے۔ غالب احمد اگر اسی طرح سوچ سمجھ کر لکھتا رہا تو نئے غزل گوؤں میں بلکہ نئے شاعروں میں سب سے آگے بڑھ جائے گا۔ مجھے اس سے بہت رغبت اور دلی پیار ہے اور بہت سی امیدیں بھی ہیں۔"

ایک اور اندراج بہت غور طلب ہے جو 26 ستمبر 52 کا ہے"۔۔۔غالب، حفیظ، شیخ، انتظار، نور کے ساتھ میٹرو گیا۔۔۔ نئی پرانی نسل پر بحث ہوئی۔ محمد حسن عسکری نے آفتاب کو انگریزی میں خط تحریر کیا ہے کہ

This younger generation will go to ashes.

نامعلوم یہ کونسی نئی نسل ہے۔ ویسے محمد صفدر، مظفر علی سید، غالب احمد اور میرے ہوتے ہوئے یہ جرات عجیب ہے۔"

تاہم ناصر کاظمی کی ان امیدوں کو پورا نہ ہونا تھا۔ غالب احمد تعلیم سے فارغ ہو کر ایر فورس سے وابستہ ہو گئے اور ان کا ٹھکانہ لاہور سے دور ہو گیا۔ طبیعت میں بے پروائی اور قلندری تھی اس لیے زیادہ چھپنے چھپانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس اثنا میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ ناصر کاظمی نے 60 کی دہائی میں مسلسل غزلوں کا سلسلہ پہلی بارش کے نام سے تحریر کیا۔ یہ غزلیں سن کر غالب احمد نے کہا کہ ناصر شعر تو تم پہلے سے کہہ رہے تھے مگر شاعری تم پر اب نازل ہوئی ہے۔ وہ ان غزلوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے مسودہ ناصر سے لے لیا کہ وہ اس کی اشاعت کا بندوبست کریں گے مگر شومئی قسمت کہ وہ مسودہ ان سے کہیں کھو گیا چنانچہ ناصر کی زندگی میں "پہلی بارش" شائع نہ ہو سکی۔ ناصر کی وفات کے بعد یہ گم شدہ مسودہ انہیں مل گیا۔ غالب احمد جب ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئر مین کی حیثیت سے سرگودھا میں تعینات تھے اس وقت ان سے یہ مسودہ لے کر ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے ان غزلوں کا مطالعہ کیا اور ناصر کاظمی پر اپنے 1973 کے مضمون میں پہلی بارش کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔

غالب احمد کا تبادلہ جب لاہور ہوا تو ناصر کاظمی رخصت ہو چکے تھے۔ اب ان کی دوستی اور ملاقات زیادہ تر حنیف رامے اور شیخ صلاح الدین کے ساتھ رہی۔ اسی اثنا میں مجھے بھی چند بار ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ 1999ء میں جب حسن سلطان کاظمی نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ناصر کاظمی سوسائٹی کی بنیاد رکھی تو ناصر کاظمی کے گھر پر جو نشست منعقد ہوئی اس کی صدارت غالب احمد صاحب نے کی۔ انتظار صاحب مہمان خصوصی تھے۔ اسی طرح اس سوسائٹی کی چند اور نشستوں میں بھی وہ تشریف لائے۔ باصر کے ساتھ چند دفعہ ان کے گھر پر ملاقات کو جانا ہوا۔

پندرہ یا شاید سولہ برس پرانی بات ہے جب میرے دوست اور شاگرد ڈاکٹر خلیل احمد گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن (سابقہ سنٹرل ٹریننگ کالج) میں پڑھا رہے تھے تو وہ کالج کی ایک تقریب میں غالب پر ایک لیکچر کروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے غالب احمد صاحب کا نام تجویز کیا۔ انہوں نے کمال شفقت کا اظہار کرتے ہوئے میری درخواست کو قبول کر لیا۔ اس دن میں نے انہیں کالج تک آمدورفت کی سہولت فراہم کی۔ ان کا لیکچر سنا اور دن بھر ان کی باتوں سے مستفید ہونے کا موقع میسر آیا۔ وہ بہت صاحب علم تھے۔ نفسیات، فلسفہ، ادب اور شاعری کا بہت گہرا مطالعہ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں بہت عمدہ گفتگو کرتے تھے۔ متعدد مضامین کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے "راحت گمنام" اور "رخت ہنر" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی وفات لاہور کی علمی اور تہذیبی زندگی کو مزید تہی مایہ کر گئی ہے۔

تعلیم الاسلام پرائمری سکول قادیان سے تعلیم الاسلام کالج ربوہ تک کا سفر

پروفیسر محمد شریف خان

والد مرحوم ڈاکٹر حبیب اللہ خان صاحب تنزانیہ افریقہ، میں ڈیوٹی پر تھے۔ مجھے 1946 میں تعلیم الاسلام پرائمری سکول قادیان میں پہلی جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ سالانہ امتحان ہوئے، قاعدہ یسرنالقرآن زبان کی تکلیف کے باعث اچھی طرح سنا نہ سکا، جبکہ دوسرے مضامین میں پاس تھا، فیل کر دیا گیا! امتحانات کے بعد موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران partition ہو گئی۔

پاکستان کے لئے ہجرت

قادیان میں دن بدن غیر مانوس چہروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر لوگ اور سامان تانگوں، گڈوں پر لدے آ رہے تھے۔ قادیان کے پر سکون ماحول میں ایک غیر مانوس سی بے چینی سرایت کر رہی تھی۔ محلے کی مسجد میں غیر مانوس لوگوں نے بستر لگا لیے تھے۔ ہم بچوں کا باہر نکلنا منع ہو گیا تھا۔ بھائی جان حفیظ امرتسر میڈیکل سکول سے کئی دن سے آئے ہوئے تھے۔ سرِ شام محلے کے لوگ گھروں میں بند ہو جاتے۔ رستے بستے شہروں کی مخصوص ہلکی سی زندگی کی بھنبھناہٹ سرِ شام ماند پڑنے لگی تھی۔ ایک ان جانا خوف و حراس دارالاماں پر اپنا مکروہ سایہ تانے جا رہا تھا۔ ناگہاں، کبھی کبھی شام کو گولیوں کے چلنے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔

گھر کے بڑے سارا دن بیٹھے پاکستان جانے کے ذرائع سوچتے رہتے۔ ضعیف والدہ کی بات تھی کہ وہ کیسے، اگر پیدل قافلے کے ساتھ جانا پڑا، اتنا لمبا سفر کر سکیں گی۔ گھر کے سٹور میں بچوں کی ایک بڑی سی pram پڑی تھی۔ اسے نکال کر صاف کیا گیا، جوڑوں میں تیل دیا گیا، منصوبہ یہ تھا اس میں رضائیاں وغیرہ بچھا دی جائیں گی اور والدہ کو بٹھا کر سفر طے کیا جائے گا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا، مجھے ٹسٹنگ کے لیے اس پر بٹھایا گیا تو پتہ چلا یہ بیکار کی کوشش تھی۔ ہم سب پریشان دعائیں کر رہے تھے۔ اباجی افریقہ میں الگ پریشان

تھے۔

بھائی جان منیر ڈیوٹی دینے جاتے شام کو خبریں لاتے۔ بسوں کے ایک دو قافلے جا بھی چکے تھے، ایک صبح ہم بھی تیار ہو کر پہنچے۔ بسیں کھچا کھچ، بھری ہوئی تھیں نفسا نفسی کے عالم میں روانہ ہوئیں۔ ظاہر ہے ہم نو افراد کو کہاں جگہ ملتی! اسی مایوسی میں آخر بڑوں نے سوچا پتہ نہیں ہمارا کیا بننا ہے کم از کم کوئی ایک تو ہم سے بچ جائے، قرعہ میرے نام پڑا، میرے دو تین جوڑے، کچھ روٹیاں ایک بچکی میں باندھ دی گئیں کچھ نقدی میری قمیض میں سی دی گئی، اور کچھ میری جیب میں۔

لاہور میں بھائی نور احمد کے گھر کا پتہ: بیرون موچی گیٹ، برکت علی روڈ، 5 قمر منزل، لاہور، لکھ کر میری جیب میں اور بچکی میں خط کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ مجھے ہر ایک نے آنسو بھری آنکھوں سے سسکیاں لیتے اور دعائیں کرتے ہوئے بھائی منیر کے ساتھ روانہ کیا۔ جب ہم تعلیم الاسلام کالج کی گراؤنڈ میں پہنچے، کھچا کھچ بھری چار پانچ بسوں کے گرد ایک اژدھام تھا، ایک طرح کی چیخ و پکار تھی۔ بھائی منیر نے مجھے بازوؤں میں اٹھالیا، اور ایک بس کی کھلی کھڑکی سے اندر دھکیلنے کی کوشش کی، گھبراہٹ سے میں نے رونا شروع کر دیا، دو دفعہ کی کوشش رائیگاں گئی۔ بسیں چلی گئیں اور ہم مایوسی کے عالم میں گھر واپس آ گئے۔

سخت مایوسی تھی، طرح طرح کے منصوبے بنتے اور ٹوٹتے۔ ایک شام جب دروازہ بند کیے مایوسی میں بیٹھے ہوئے تھے، دروازہ کھٹکا، سب ڈر گئے۔ پاس جا کر پوچھا: کون ہے؟ باہر سے خالہ زاد بھائی نور احمد کی آواز تھی: میں نور احمد۔ دروازہ کھولا، سب سے گلے ملے۔ انہوں نے بتایا وہ ایک فوجی ٹرک لیکر ہمیں لینے آئے ہیں، اور صبح سے ہمارے گھر کا پتہ کرتے کرتے اب ہم تک پہنچے ہیں۔ ہم سب نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کیسے ناامیدی میں امید پیدا کر دی۔ الحمدُللّٰہ

اگلی صبح ہم تیار ہو کر بسوں کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمارے ٹرک میں لوگ سوار ہو چکے ہوئے تھے، تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ انتظام پر معمور خدام کو بھائی نور احمد اور بھائی منیر نے جا کر بتایا۔ ہمارے لیے جگہ بنائی گئی۔ بے جی بھائی منیر کو بار بار کہتیں اور التجائیں کرتیں رہیں کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو، مگر انہوں نے کہا میری ڈیوٹی ہے میں بعد میں آؤں گا، اور بھیڑ میں گم ہو گئے۔ والدہ مرحومہ دیر تک اداسی سے روتی رہیں۔

ہماری کانوائے میں سات بسیں تھیں، موسم برسات اور ٹریفک کی بھیڑ کی وجہ سے سڑک پر کھڈے پڑے ہوئے تھے، بسیں رینگنے کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ جب شام ہوئی اور ہم تقریباً امرتسر شہر میں داخل ہو رہے تھے، کہ ایک بس کا انجن فیل ہو گیا۔ بھائی نور احمد فوج میں موٹر مکینک تھے، کیا کر سکتے تھے، ہر طرف اندھیرا تھا کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا، بیٹری مہیا نہیں تھی۔ پتہ کیا گیا کسی کے پاس ماچس ہے، آخر ایک سگرٹ نوش کام آئے۔ ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر تاریں جوڑیں اور بس سٹارٹ ہو گئی۔ سب نے شکر ادا کیا۔

بھائی جان حفیظ پہلے لاہور پہنچ چکے تھے اور کرشن نگر میں ایک گھر آلاٹ کروالیا ہوا تھا، اور بازار میں ایک ہومیو پیتھک کی دکان بھی انہیں مل گئی تھی۔ بھائی جان ہومیو پیتھک کی چھوٹی چھوٹی بوتلیں لے کر آتے ہم انہیں صاف کرتے جاتے اور لنڈے بازار میں بیچ کر کچھ نقدی مل جاتی۔ افراتفری کا زمانہ تھا۔ بے جی (والدہ) نے کچھ نقدی بچا کر رکھی تھی جس سے گزارا ہو رہا تھا۔ ہم لاہور میں ٹھہر کر بھائی منیر کے قادیان سے پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ناگہاں دفتر سے بھائی کی شہادت کی اطلاع ملی۔ تفصیل کے

مطابق بھائی جان سکھ حملہ آوروں کا مقابلہ اباجی کی دونالی بندوق سے کرتے رہے، آخر کار حملہ آور رات کے اندھیرے میں پیچھے سے گھر کے دیوار پھاند کر آئے اور انہیں پیٹ میں چھرا گھونپ کر شہید کر دیا۔ جب خدام صبح پتہ کرنے گئے تو بھائی صحن کے درمیان چت پڑے تھے اور انتڑیاں باہر پھیلی ہوئیں تھیں۔ اناللہ وانا الیہ اجعون۔ بے جی اور بڑوں کی غم سے بری حالت تھی۔

اب ہمارا لاہور میں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بسوں میں بڑی بھیڑ تھی، چنانچے ہم نے ایک گڈے والے سے بات کی، اس نے چکسان پہچانے کی حامی تین سو روپے میں بھر لی۔ ہم اور ہمارا جو بھی اثاثہ تھا، گڈے پر لد گئے۔ اور آہستہ آہستہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ مجھے شاہدرہ گوجرانوالہ کی سڑک ابھی تک یاد ہے جس کی جانبین میں کھجور کے درخت تھے۔ میں نے پہلے کبھی کھجور کا درخت نہیں دیکھا تھا۔ رستے میں جب بیل آرام اور چارے کے لیئے رکتے ہم بھی اُتر کر گھاس وغیرہ پر کھیس بچھا کر آرام کر لیتے۔ ہماری سواری رات بھر چلتی رہتی۔ آخر کار سو میل کا یہ سفر اللہ اللہ کر کے چوتھے دن ختم ہوا اور ہم اپنے گاؤں پہنچ گئے۔

دادی جان اور گاؤں کے لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔ دادی جان ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ہم اپنے آبائی گھر میں خوب دوڑے پھرے۔ بے سروسامانی کی حالت تھی، بھائی منیر کی شہادت سے سب نڈھال تھے، بے جی کا برا حال تھا، ہر وقت دروازے کی طرف نظریں ٹکائے رکھتیں، کہ منیر اب آیا کہ اب آیا۔

اباجی کی آمد

گھریلو حالات سے آگاہ ہوتے ہی اباجی early retirement لیکر 1948 کے شروع میں افریقہ سے گاؤں پہنچ گئے۔ اور گھر کے حالات کو سنبھالا دیا۔ مجھے تین میل دور گاؤں کوٹ سعد اللہ میں پرائمری سکول میں داخل کرادیا گیا۔ ہمارے احمدی ہونے کی خبر سب جگہ پہنچ چکی تھی۔ جب اباجی مجھے سکول میں داخل کروانے گئے، اہل حدیث ہیڈ ماسٹر مولوی فیروز اباجی سے مذہبی بحث میں الجھ گیا۔ خیر اس دن تو بات آئی گئی ہو گئی۔ اگلے دن بہانہ بنا کر میری مکوں اور تھپڑوں سے خوب پٹائی کر دی۔ میں نے گھر میں اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔

اباجی نے چک سان سے تین میل دور قصبے گکھڑ منڈی کے میں بازار میں "قریشی میڈیکل ہال" کے نام سے شفاخانہ کھول لیا۔ اباجی ہر روز صبح صبح تین میل سوئے (چھوٹی نہر) کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر سائیکل پر گکھڑ جاتے اور شام واپس آتے۔ اب میں حیران ہوتا ہوں اباجی کے ہمت پر۔ اباجی کے دونوں گھٹنوں میں arthritis کی وجہ سے سخت درد تھی، جسم بھاری تھا۔ یہ سب سختی آپ نے میرے پانچویں کے امتحان تک برداشت کی۔ گھر میں مجھے اور دوسرے بچوں کو اردو، انگریزی کے ساتھ ساتھ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی کتب کا درس دیتے، ظہر عصر کی نماز کے بعد ہم اپنا اپنا قرآنِ کریم لے کر بیٹھ جاتے، اور ایک ایک رکوع پڑھتے، اباجی ترجمہ پڑھتے اور ہم دہراتے جاتے۔ اباجی کی اس مہربانی کے باعث ابتک ہم بہن بھائیوں کو خدا تعالیٰ کے فضل سے قرآنِ کریم کا ترجمہ سمجھنے میں الاماشااللہ کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی، الحمد للہ

وقفِ زندگی

میرے پرائمری کا امتحان پاس کرتے ہی ہم قصبے گکھڑ منڈی میں منتقل ہو گئے۔ میں ڈسٹرک بورڈ ہائی سکول (ڈی۔بی ہائی سکول) کی چھٹی جماعت میں داخل ہو گیا۔ میں آٹھویں جماعت کا طالب علم

تھا، جب 1954-55ء کے لگ بھگ حضرت مصلح موعودؓ نے وقفِ زندگی کے موضوع پر مسلسل کچھ خطبات دیئے۔ ان خطبات سے متاثر ہو کر ایک روز اباجی نے مجھے بلا کر کہا "تم نے حضرت صاحب کے خطبات سنے ہیں۔ اللہ نے مجھے چار بیٹے دیے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنے دو بیٹے اللہ کے رستے میں وقف کروں، دو دنیاداری میں پڑے ہوئے ہیں۔ پہلے منیر وقف تھا شہید ہو کر اللہ کے پاس ہے۔ اب تم سب سے چھوٹے ہو تم خدا کی راہ میں زندگی وقف کر دو، تاکہ میری زندگی کے دونوں پلڑے یکساں ہو جائیں"۔ میرا ہاں میں جواب سن کر اباجی بہت خوش ہوئے، اور حضرت امام جماعت احمدیہ الثانیؓ کی خدمت میں وقف کی منظوری کے لیے عریضہ لکھ دیا۔

حضرت صاحب نے ایک خطبے میں ذکر فرمایا کہ "وقفِ زندگی کی تحریک کے جواب میں جو درخواستیں آئی ہیں ان میں سے ایک تو ابھی بہت چھوٹے ہیں"۔ شاید حضور کا یہ اشارہ میری طرف تھا۔ کچھ دنوں میں دفتر تبشیر سے اباجی کے نام ہدایت آئی، کہ حضور نے وقف منظور فرمالیا ہے۔ میٹرک کے بعد بچے کو جامعہ میں داخل کرائیں۔

اسی زمانے میں میں نظامِ وصیت میں بھی شامل ہو گیا۔ الحمدُللہ

جامعہ کی بجائے کالج میں داخلہ

میٹرک پاس کرنے کے بعد اباجی مجھے لیکر جامعہ احمدیہ میں داخلہ دلانے ربوہ پہنچے۔ جولائی کا مہینہ اور بدھ کا دن تھا، ربوہ میں سخت گرمی تھی، تانگے پر سیدھے جامعہ میں پہنچے، جامعہ میں سالانہ کھیلوں کے بعد دو چھٹیاں تھیں۔ اباجی کی طبیعت میں کسی قدر سختی اور جوش تھا۔ جامعہ کو بند پا کر جامعہ کے پرنسپل حضرت مولانا ابو العطاصاحب جالندھری کے کوارٹر تحریک جدید پہنچے۔ حضرت مولوی صاحب سے ملاقات کے وقت بے تکلفی سے کہا: "مولوی صاحب! لو جی قربانی کا بکرا لے آیا ہوں۔ اسے جہاں چاہیں باندھیں، مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے میں تو واپس چلا۔"

حضرت مولوی صاحب نے فرمایا کہ جامعہ میں تو چھٹی ہے۔ آپ ٹھہریں، دو دن کے بعد جامعہ آجائیں۔ والدِ محترم نے فرمایا: "سخت گرمی ہے میں یہاں زیادہ رک نہیں سکتا۔ حضرت مولانا نے فرمایا: "تو پھر اسے کالج میں داخل کروا دیں وہاں سے ڈاکٹر بن کر یا ایم اے کر کے سلسلے کی خدمت کر سکتا ہے"۔ چنانچہ اس طرح میں کالج میں فرسٹ ائیر پری میڈیکل میں داخل ہوا۔ میری ریاضی میں کمزوری آڑے آئی، ایف ایس سی میں اتنے نمبر نہ آئے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا، فزکس اور کیمسٹری میں حسابی سوالات کے باعث میرے نمبر کم رہے۔

بی ایس سی میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں داخلہ لیا، جہاں کریسنٹ ہوسٹل میں رہا، باٹنی، زوالوجی اور انگریزی کے مضامین تھے۔ زوالوجی میں اول رہا اور بی ایس سی میں فرسٹ کلاس حاصل کی، کالج کا میڈل اور رول آف آنر ملا۔

گولڈ میڈل اور ٹی آئی کالج سے وابستگی

پنجاب یونی ورسٹی میں ایم ایس سی زوالوجی میں داخلہ لیا۔ 1963ء کے سالانہ امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ کی پوزیشن حاصل کی اور Sir William Roberts Gold Medal حاصل کیا۔ اباجی نے فوراً حضرت صاحب کی خدمت میں تحریراً عرض کر دیا۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل سے جواب آیا کہ ٹی آئی کالج جائن کریں۔ میں نے موسم گرما کی تعطیلات کے بعد ستمبر 1963 میں تعلیم اسلام کالج ربوہ لیکچرر بیالوجی کی حیثیت سے جائن کیا۔ الحمدُللہ۔ چھتیس (36) سالہ خدمت کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں

11 ستمبر 1999 کے دن کالج سے ریٹائر ہوا۔ الحمدُللہ

ایک دعا کی درخواست

آخر میں میں اپنے بیالوجی کے استاد پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد بشیر صاحب مرحوم کے لیے درخواستِ دعا کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف تعلیم الاسلام کالج لاہور میں طالبعلم رہے اور 1956 میں پنجاب یونیورسٹی کے ایم ایس سی ذوو الوجی میں گولڈ میڈیلسٹ تھے۔ آپ 1957 میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں میرے استاد تھے۔ 1965 میں اتفاقاً مسجد اقصیٰ ربوہ میں جمعہ کے دن موصوف سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا، خوش ہوئے کہ میں انکی جگہ پر کالج میں ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ آپ امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے۔ اور غیر از جماعت افراد کی سخت مخالفت میں فیصل آباد میڈیکل کالج میں فزیالوجی کے پروفیسر رہے۔ آپ نے ہمیں بہت محنت سے پڑھایا تھا۔ آپ کچھ عرصہ بیمار رہ کر وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ احباب سے مرحوم کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

☆☆☆

گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر (ربوہ) کی نئی عمارت

"میں پیدائشی پاکستانی تھا اور پاکستانی کی حیثیت میں دنیا سے جاؤں گا"

ڈاکٹر عبد السلام اور چین

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی
ترجمہ: زکریا ورک

پاکستان کے اساطیری نظری طبیعات دان عبد السلام میں پبلک کی دل چسپی پوری دنیا میں نیٹ فلکس پر ریلیز ہونے والی ڈاکومنٹری "سلام، دی فرسٹ ۔۔۔نوبل لارئیٹ" میں مؤجزن ہوئی ہے۔ اگرچہ ڈاکومنٹری ان کے سائنسی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے، بلکہ ان کی ذاتی تلخیوں پر اس سے بھی زیادہ، مگر اس میں بڑی خامی یہ ہے کہ ان کے چین مشنز کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس خامی کے لئے فلم بنانے والوں کو مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عبد السلام کی زندگی کا یہ پہلو عام طور پر پردہ اخفا میں رہا حتی کہ ان کے رفقائے کار سے بھی جو ان سے بہت اچھی طرح شناسا تھے۔

تاہم دو چینی سائنسدانوں جنگ ہان سن Jinghan Sun اور ایگز آو ڈانگ ین Xiaodong Yin نے اس مخفی پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کا مقالہ عبد السلام اینڈ چائنا: چین کی سائنسی ڈیویلپمنٹ پر سلام کا انفلوئینس ان کی چھ چین یاترا پر ایک نگاہ۔ بیجنگ سے مارچ 2019 میں ایک چینی زبان کے رسالے میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس مقالے کی بنیاد ان اجلاسوں کی کاروائی کی رپورٹیں ہیں جو چائینز اکیڈیمی آف سائنسز میں منعقد ہوئی تھیں۔ میرے چینی طبیعات دان دوستوں نے اس کے کچھ حصوں کا انگلش میں ترجمہ کیا ہے جس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

ان دو چینی سائنسدانوں کے مقالے سے یہ پتہ چلتا کہ سلام نے پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کے حاصل کرنے کے لیے چین کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ امر کسی حد تک اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں مدد کرتا: پاکستان کے بمب پروجیکٹ میں سلام کا کیا کردار تھا۔؟ سلام کے اعداء کا کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی رول ادا نہیں کیا تھا جبکہ کچھ لوگ کہتے کہ

انہوں نے پاکستان کے نیوکلئیر راز امریکہ، اسرائیل اور بھارت کو دے دیے تھے۔ اس کے برعکس ان کے مداحوں کا کہنا ہے کہ سلام امن پسند انسان تھے جو جوہری ہتھیار کبھی بھی حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تو پھر کس بات میں صداقت ہے۔؟

حقائق اب طشت از بام ہو کر ہمارے سامنے ہیں۔

پروفیسر سلام 1950 کی دہائی میں اکیڈیمک سپرسٹار بن چکے تھے۔ وہ چھ دفعہ چین گئے اور چین کے اعلیٰ افسران سے ملاقاتیں کیں۔ پہلی بار وہ چین 1958 میں گئے جب وہ صدر ایوب خاں کے ہمراہ سائنسی مشیر کے طور پر گئے تھے اور وزیر اعظم ژاؤ این لائی سے تنہا شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ دونوں کے درمیان پرجوش ذاتی تعلق قائم ہو گیا۔ پھر وزیر اعظم ژاؤ این لائی کی دعوت پر 1959 میں سلام چین ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ اس وقت تک چین نیوکلئیر پاور نہیں بنا تھا اور صدر ایوب خاں کو جوہری ہتھیاروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حالات میں زبردست تبدیلی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد 16 دسمبر 1971 کو آئی۔ اس کے محض چھ ہفتوں بعد صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے 20 جنوری 1972 کو ملتان میں پاکستانی سائنسدانوں کی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ جذباتی بھٹو نے ان سائنسدانوں کو تلقین کی کہ وہ ایٹم بم بنائیں، اس خواہش کا اظہار اس نے پہلی بار 1965 میں کیا تھا۔ سلام بھی اس وقت وہاں موجود تھے اور اظہار خیال کیا تھا۔

سن اور ین Sun-Yin کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد بھٹو نے سلام کو 1972 میں چین بھیجا تا جوہری ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی حاصل کرنے میں چین کا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ رپورٹ کے صفحہ 120 پر مصنفین رقم طراز ہیں کہ سلام نے اپنی تیسری وزٹ کو غیر معمولی وزٹ not an ordinary visit قرار دیا تھا۔ وزیر اعظم ژاؤ سے 5 ستمبر 1972 کی شام کو ہونے والی میٹنگ میں سلام نے نیوکلئیر تعاون کی درخواست خدمت گزار کی۔

وزیر اعظم کا جواب مدبرانہ تھا: ”چائینیز اکیڈیمی آف سائنسز نے اس پر بڑی احتیاط سے غور و فکر کرنا ہے اور اس کے مطابق تیاریاں کرنی ہیں۔ ہم تمہارے یہاں تجربے اور ٹیکنالوجی کیلئے چند افراد بھیج دیں گے“۔ یہ بات صاف نہیں کہ آیا مصنفین اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں جب وہ لکھتے ہیں:

”سلام اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے، اگرچہ چائنا ان کے ساتھ روادار تو تھا مگر اس کے ساتھ حد درجہ محتاط بھی“۔

لیکن حال ہی میں شائع ہونیوالے ایک اور مضمون جو امریکہ کی کارنیل یونیورسٹی کے ڈاکٹر ینگ ینگ چینگ Dr. Yangyang Cheng نے ضبط تحریر میں لایا ہے اس کے مطابق سلام کی چین وزٹ کے دو مہینے بعد ایک چائنیز ٹیم جس کے سربراہ جیانگ شین جی Jiang Shenjie تھا اس ٹیم نے کانوپ (KANUPP کراچی نیوکلئیر پاور پلانٹ) جو کینیڈین حکومت نے تحفہ میں دیا تھا، اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی۔ جیانگ پیشہ کے لحاظ سے کیمسٹ اور نیوکلئیر انجنئیر تھا جس نے چین کے جوہری ہتھیاروں کے پروگرام میں بنیادی رول ادا کیا تھا، نیز وہ بیجنگ کے اٹامک انرجی انسٹی ٹیوٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔

سلام نے بم پراجیکٹ کی ذمہ داری تو قبول کر لی لیکن انہوں نے بم ڈیزائن کی تفصیل میں شرکت نہیں کی۔ نیوکلئیر ایمپلوژن اب فرسودہ ہو چکا تھا اور وہ بڑے بڑے اہم ترین کاموں میں مصروف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ستمبر 1972 میں اپنے سابق شاگرد رشید ڈاکٹر ریاض الدین (وفات 2013) کو ٹریسٹ (اٹلی) میں بم ڈیزائن کے لئے اپنے آفس میں مدعو کیا۔ ریاض الدین میرے سینئیر رفیق کار نے قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں فزکس ڈیپارٹمنٹ کی داغ بیل رکھی تھی اور ذہنی استعداد کے مطابق وہ اس کام کیلئے بالکل موزوں شخص تھے۔

سلام نے ریاض الدین کو ہدایت کی کہ وہ نیوکلئیر امپلوژن کی فزکس کا درک حاصل کرنے کے لئے تھیوری ٹیشنز کا گروپ تشکیل دے۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چئیرمین منیر احمد خاں جس کے ساتھ سلام کے دوستانہ مراسم تھے، نے اس سمجھوتے کی منظوری دے دی۔ ریاض الدین جس کو عزت و وقار کا حامل تمغہ ہلال پاکستان 1998 کے نیوکلئیر ٹیسٹ کے بعد تفویض کیا گیا تھا اس نے فرض سمجھتے ہوئے حکم کی اطاعت کی۔ یہ سارا کام کس طرح رنگ میں پایہ تکمیل کو پہنچا، وہ ریاض الدین کی سوانح میں دیکھا جاسکتا ہے

جو عنقریب منصہ شہود پر آنے والی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا ریاض الدین گروپ کا معلوماتی ذخیرہ اس ضمن میں اہم تھا؟ امریکنوں کا کہنا تھا کہ پاکستان کے پاس جوہری ہتھیاروں کے اس ٹیسٹ کے تفصیلی بلیو پرنٹ تھے جو چین نے 1960 میں کیا تھا۔ ان بلیو پرنٹس کا ایک پلندہ بحری جہاز BBC Cargo سے ضبط کیا گیا تھا جو لیبیا کی جانب روانہ تھا۔ مزید جوہری مواد جو ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے بیچا تھا وہ بھی پکڑا گیا تھا۔ اس کے بعد صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو حکم دیا تھا کہ وہ پی ٹی وی پر آکر اظہار ندامت کریں۔

بالفرض محال پاکستان کے پاس بلیو پرنٹس ہوتے تب بھی وہ بالکل

مترجم ڈاکٹر سلام کے ساتھ

بے سود تھے جب تک کہ بم بنانے میں کارفرما تھیوریٹیکل پرنسپلز کی سوجھ بوجھ نہ ہو۔ لیبیا کے پاس یہی بلیو پرنٹس تھے مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔ پاکستان کے لئے فزکس کے علم کے ساتھ ڈیزائن ٹمپلیٹ کے ہونے سے مزعومہ کام سہل ہو گیا۔ یوں کسی ایٹم بم کی طاقت میں کمی بیشی کرنا قدرے آسان ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بموں کے ڈیزائن میں ردوبدل کرنے کی صلاحیت حاصل کرنا بھی ممکن ہو گیا۔

یہ بات کہ سلام نے جوہری راز دوسرے ملکوں کو فریب سے فروخت کر دئے سراسر بے بنیاد جھوٹ ہے ان لوگوں کا ساختہ جھوٹ جو خود ان کالے کرتوتوں میں ملوث تھے اور اس کے بعد ان کا کچا چھٹا کھل گیا۔ سلام بم کے ڈویلپمنٹ کام میں شامل نہیں تھے ماسوا عمومی طور پر نیز وہ ٹیکنیکل رازوں سے قطعی طور پر بے بہرہ تھے۔

تاہم سلام کے لئے بہت بڑا ذہنی صدمہ آنیوالا تھا۔ 1974 نے ان کی زندگی کو اتھل پتھل کر دیا۔ سلام غم سے نڈھال ہو گئے جب بھٹو کی حکومت نے ان کی احمدیہ کمیونٹی کو نان مسلم قرار دے دیا۔ اس سے قبل احمدی ہونے کے ساتھ پاکستانی قوم پرست ہونا ممکن تھا۔ اگرچہ سلام نے شجاعت کے ساتھ احمدی اور قوم پرست ہونے کی کوشش کی مگر اٹامک بم کی طرف ان کا رجحان رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا گیا۔ بالآخر کار انہوں نے اٹامک بم کو انسانیت کی بقاء کے لئے خطرہ جان لیا۔

اختتامیہ

میری زندگی کے بے شمار چھوٹے یا بڑے تاسفات میں سے ایک یہ ہے کہ میں کبھی جرات نہ کر سکا کہ سلام کے ساتھ بم کے مسئلے پر گفت وشنید کروں۔ 1984 سے لے کر ان کی وفات سے دو یا تین ماہ قبل 1996 تک انہوں نے اور میں نے گوناگوں مسائل جیسے سوشل، پولیٹیکل اور سائنٹفک پر بحث کی، لیکن اس موضوع پر کبھی نہیں۔ کیا ان کو اپنی گزشتہ کوششوں پر کوئی تاسف تھا؟ ان کو یہ معلوم تھا کہ میں نے جوہری ہتھیاروں کے خلاف اکثر لکھا اور بولا ہے (بشمول پاکستان کے)۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ سلام کے احساسات میں تبدیلی آگئی تھی مگر میں نے خود کو جونئیر سمجھا کہ یہ سوال ان کے گزارش کروں۔

(بہ شکریہ روزنامہ ڈان 30 نومبر 2019)

https://www.dawn.com/news/1519654/abdus-salam-in-china

ایک عہد ساز وجود جو اپنا عہد نبھا گیا
ڈاکٹر صلاح الدین مرحوم

امتیاز احمد راجیکی

صدمہ اور صبر کا ادغام ایک ایسی حقیقت ہے جس کا صحیح معنوں میں ادراک اسی وقت ہوتا ہے جب وہ وارد ہو اور فی ذاتہٖ اس تجربے میں سے گزرنا پڑے۔

10 ستمبر 2017 کی سہ پہر شاید زندگی کے ایسے ہی ایک تجربے کی انتہا تھی جب میرے بیٹے منور راجیکی کی رندھی اور سسکتی ہوئی آواز میں پیغام ملا کہ ڈاکٹر صلاح الدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ ابتدأً تو یہی سمجھ میں آیا کہ وفات گر جانے کے باعث ہوئی ہے، لیکن اُس وقت کسے ہوش تھا کہ اسباب و وجوہات کی کرید کی جائے۔ فوری طور پر کام سے چھٹی کی اور بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ منور بھی بے قرار تھا کہ اپنے استاد، محسن اور مربّی کے آخری دیدار اور رسومات میں شامل ہو سکے، مگر ایک بہت ہی اہم فریضہ اس تمنا کی راہ میں حائل ہو گیا۔

طوفانِ باد و باراں "ارما" (Hurricane "Irma") نے ایک مہیب عفریت کی طرح پہلے جزائر غرب الہند اور کیوبا کو مسمار کیا، پھر امریکہ کی ساحلی ریاست فلوریڈا کے جنوبی اور مغربی علاقوں کو روندتا ہوا شمال اور مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسے ناگہانی مواقع پر قدرتی آفات و مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے جماعت احمدیہ کی امدادی و اعانتی تنظیم "ہیومینیٹی فرسٹ" (Humanity First) ہمیشہ پیش پیش ہوتی ہے۔ اس ادارے کے جنوب مشرقی زون کے رضاکار ناظمِ اعلیٰ کے طور پر منور کے کاندھوں پر بڑی بھاری

ذمہ داری تھی۔ امدادی کارروائیوں کے سارے بندوبست اسی کے سپرد تھے۔ خصوصیت سے طوفان گزرنے کے بعد ایک مشکل اور صبر آزما دور سے گزرنا تھا جس میں اپنی رہائش گاہ پر ایک عارضی کیمپ کا قیام اور ملک بھر سے آنے والے رضاکاروں (volunteers) کے قیام و طعام کے انتظامات بھی شامل تھے۔ یہ ایک ایسا امتحان تھا جو اس کے وجود کو کچلے جا رہا تھا——لیکن بحمد للہ وہ اس آزمائش میں سرخرو ہوا کہ فرض کی ادائیگی پر محبت و جذبات کو قربان کرنے کی سعادت پائی۔

——

مگر وہ شخص جس نے ہماری خدمت میں ساری زندگی صَرف کر دی اس کی آخری خدمت سے محروم ہونے کے لیے میرے پاس کوئی جواز اور عذر نہیں تھا——طوفانِ بلا کے باعث فلوریڈا کے تمام ایئر پورٹ بند تھے اور ساری فلائیٹیں ملتوی ہو چکی تھیں۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اکیلے ہی گاڑی دباؤں اور اس سے پہلے کہ طوفان سارے راستے مسدود کر دے شمالی ریاست پنسلوینیا کا رخ کروں۔ اگر مَیں صبح ہونے کا انتظار کرتا تو شدید خطرہ تھا کہ اگلے کئی دنوں کے لیے وہیں پر منجمد ہو جاتا اور کہیں بھی ہلنے نہ پاتا۔ چنانچہ ساڑھے چار بجے عصر کے وقت مَیں کار میں تھا۔ اس عرصے میں مسلسل بارش اور تیز جھکڑ شروع ہو چکے تھے مگر ان میں اتنی تندی نہیں تھی کہ سڑکیں بند کر دی جاتیں۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی؛ کیونکہ قریباً ستّر لاکھ افراد ایک روز پہلے تک جبری بے دخلی (compulsory evacuation) کے تحت نقل مکانی کر چکے تھے۔ البتہ فلوریڈا کی سمت امدادی کاروانوں (rescue fleets) کے سلسلے شمالی ریاستوں بلکہ کینیڈا تک سے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے جتھوں کی صورت میں مسلسل مدد کے لیے چلے آ رہے تھے۔

بذریعہ کار میرا یہ سفر بارہ سے چودہ گھنٹے کا تھا۔ مَیں نے احتیاطاً ریسرچ ٹرائینگل پارک (RTP) کے صدر جماعت عزیزم عبد الہادی احمد کو فون کر دیا تھا کہ شاید رات کو مجھے ان کی مسجد میں ٹھہرنا پڑے۔ عزیز موصوف کہنے لگے: "انکل، آپ میری طرف ٹھہریں گے۔" انہوں نے اپنے گھر کا ایڈریس بھی ٹیکسٹ کر دیا۔ جب مَیں ان کے گھر سے آدھے راستے پر پہنچا تو مَیں نے حساب لگانا شروع کر دیا کہ اگر مَیں اس طرف گیا تو مجھے دو گھنٹے کا اضافی سفر کرنا پڑے گا؛ کیونکہ ان کی رہائش گاہ کیری (Cary) میں تھی جو انٹر سٹیٹ ہائی وے 95 سے کافی فاصلے پر تھی۔ چنانچہ مَیں نے ہادی کو فون کیا کہ مَیں سیدھا "میری لینڈ" جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو راستے میں کہیں رک جاؤں گا۔

"نہیں راجیکی صاحب، آپ لازماً میری طرف آئیں گے۔ رات کو اتنا لمبا سفر نہیں کریں۔ مَیں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

عزیزم ہادی احمد جو تقریباً میرے بیٹے کے ہم عمر ہیں، بہت ہی شاندار نوجوان ہیں۔ ان کی ایک بات بڑی عجیب اور پیاری لگتی ہے۔ جب وہ میرے ساتھ بے تکلف پرائیویٹ گفتگو کرتے ہیں تو انکل کہتے ہیں اور جب بحیثیت معاون صدر انصاراللہ یا (سابق) افسر جلسہ سالانہ کے طور پر جماعتی گفتگو کرنی ہوتی ہے تو راجیکی صاحب کہتے ہیں۔

میرے لیے اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ مَیں ان کی پیشکش قبول نہ کروں۔ اور یہ اس لحاظ سے ایک سنگِ میل بھی ثابت ہوا کہ ان کی بیوی، جو "شاہین" والے برادرم عزیزم عبد السلام کی بیٹی اور ہمارے لنگر کے ذیشان کی بہن ہے، کو ایک خوبصورت گھر میں خوش و خرم حالت میں دیکھا۔ مجھے یہی علم تھا کہ ہادی کی تین بیٹیاں ہیں۔ مَیں ان کے گھر تہجد میں دعا بھی کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ انہیں خوبصورت و خوب سیرت دینی دنیاوی، مادی روحانی ترقیات کا حامل خادمِ دین بیٹا بھی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے علم تھا کہ اس کا ایک عاجز بندہ اس کے حضور اس سلسلے میں التجا کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے اس مسرت اور اظہارِ تشکر سے نوازا جب عزیزی ہادی نے بتایا کہ ان کا پانچ سالہ بیٹا بھی سکول گیا ہوا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

سوموار کی صبح دوبارہ سفر شروع کیا اور مزید چھ گھنٹے گزارنے کے بعد صلاح الدین کے گھر "چیمبرزبرگ" (Chambersburg) پنسلوینیا سٹیٹ میں پہنچا۔ لان میں ایک ٹینٹ لگا دیا گیا تھا اور دور دور سے بیسیوں سوگوار تعزیت کے لیے موجود تھے جن میں سے اکثریت ہمارے ساتھ لنگر میں کام کرنے والے ورکرز کی تھی۔ اپنے محبوب قائد، محسن استاد اور بے تکلف ساتھی کی جدائی پر دل غم زدہ اور آنکھیں اشکبار تھیں مگر اللہ تعالیٰ کی رضا پر سب راضی تھے۔ اس کی بہنیں غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہونے کے باوجود صبر و استقامت کا پہاڑ دکھائی دے رہی تھیں۔ کوئی واویلا تھا نہ آہ و فغاں۔ اک سکوت تھا، سکون تھا اور دعا ہی دعا——

مَیں نے جب بہنوں سے تعزیت کی تو بڑی آپا جان نے بڑے حوصلے اور صبر سے کہا: "صلاح الدین تمہارا بڑے پیار سے ذکر کیا کرتا تھا۔ لنگر پر جو تم نے مضمون لکھا تھا، اس نے مجھے دکھایا تھا۔"

—— لیکن جو مضمون اس کی وفات کے بعد لکھ رہا ہوں، وہ تو

یہاں کسی کو نہ دکھا سکے گا، مگر کیا معلوم خدا تعالیٰ اسے جنت میں دکھا دے کہ اس کی خدمتوں اور محبتوں کی قدر کرنے والے کتنے بے شمار وجود ہیں جو اس کے احسانوں سے صدقہ جاریہ کی طرح فیض پا کر ہمیشہ ان خوبصورت یادوں کو دل میں بسائے ہوئے ہیں۔

صلاح الدین کا جسدِ خاکی ہسپتال سے تجہیز خانہ (funeral home) منتقل ہو چکا تھا؛ تاہم غسل کا پروگرام اگلے روز منگل کو تھا۔ مَیں نے سکون ہی سکون تھا۔ سکوت ہی سکوت تھا۔۔۔۔۔۔

مَیں نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس کی ٹھنڈی پیشانی کو بوسہ دیا۔ شبنم کی ہلکی سی "ترولی" اس خنکی کو اور ٹھنڈا کیے جا رہی تھی۔ نیم بھینچی ہوئی مٹھیاں گویا ابھی بھی لنگر کی کسی دیگ میں چلانے والے کڑچھے کو تھامے ہوئے تھیں۔ پاؤں میں پڑے ہوئے گہرے گٹھے امتدادِ زمانہ کی ہر منزل کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس کی انتھک محنتوں اور بے پایاں کاوشوں کا پتا دے

درخواست کی کہ میرا انتظار کریں۔ مَیں خود اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی کی آخری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

اگلے روز جب تمام عزیز اکٹھے ہو گئے تو ہم سب فیونرل ہوم پہنچ گئے ۔۔۔۔۔۔اور پہلی بار دیکھا کہ وہ وجود جو کبھی خاموش نہ بیٹھتا تھا، تھکن سے چور ہو تب بھی شکایت نہ کرتا تھا، آج چپ چاپ ایک تخت پر پڑا تھا؛ جیسے ایک معصوم بچہ ماں کی آغوش میں سکون کی نیند سو رہا ہو۔ اس کا سرخ و سپید جھریوں سے پاک خوبصورت اور شفاف چہرہ ایک سکون، طمانیت اور مطمئن نفس کا عکاس تھا۔ آج اس پر کوئی تناؤ تھا نہ ہیجان۔ کوئی ولولہ تھا نہ جوش۔۔۔۔۔۔ رہے تھے۔ تاریک وادیوں اور مہیب گھاٹیوں کی صحرانوردی کے عکاس تھے۔

عزیزوں دوستوں کے اس سارے گروہ میں وسیم ملک اور اکرم خالد کے علاوہ شاید کسی اور کو غسل میت کا زیادہ تجربہ نہیں تھا؛ لہٰذا ان دونوں نے کفن کے کپڑے کو ترتیب دینا شروع کیا اور مَیں نے اپنے ہاتھ سے اپنے سب سے زیادہ پیارے دوست اور بھائی کو غسل دینا شروع کیا اور نو آموز عزیزوں کو غسل کا طریق سمجھنے اور اس میں شامل ہونے کا موقع دیا۔

اس فرض کی ادائیگی کے فوراً بعد مَیں واپس مسجد "بیت الرحمان" سلور سپرنگ (میری لینڈ) آ گیا۔ مَیں نے حضورِ انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہٖ العزیز

کی خدمت میں بھجوانے کے لیے صلاح الدین کی یاد میں ایک مضمون لکھنا شروع کیا ہوا تھا۔ محترم جنرل سیکرٹری برادرم عزیزم مختار ملہی صاحب اور عزیزی علی باجوہ بار بار زور دیتے کہ گیسٹ ہاؤس چلے جاؤں مگر میرا اصرار یہی تھا کہ جو سہولت مجھے مسجد میں ہے اور اس کے غربی کونے میں سکون اور آرام سے مَیں اپنا کام کر سکتا ہوں، گیسٹ ہاؤس کے تکلفات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ساری رات لکھتا رہا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد بھی سونے کا موقع نہ ملا؛ کیونکہ افسر جلسہ سالانہ عزیزم مکرم بشیر ملک صاحب کی کار میں نائب امیر مکرم و محترم ملک مسعود صاحب اور عزیزم مکرم مختار ملہی صاحب کے ساتھ ساڑھے سات بجے سنٹرل نیو جرسی تدفین کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے مسجد "بیت الرحمان" ہیڈ کوارٹرز میں بعد نماز ظہر جنرل سیکریٹری صاحب نے صلاح الدین کے خاندان اور جماعتی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا اور مشنری انچارج مکرم مولانا اظہر حنیف صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی. جس میں یومِ تعطیل (week end) نہ ہونے کے باوجود کثیر تعداد میں احبابِ جماعت نے شرکت کی۔ مسجد کاہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسجد "بیت الہادی" اولڈ برِج (Old Bridge) نیو جرسی میں بھی ایک بہت بڑی تعداد دوبارہ نماز جنازہ کی ادائیگی اور بعد ازاں تدفین میں شامل ہوئی۔

دھرتی ماتا کا ایک سپوت بظاہر مَنوں مٹی تلے آسودۂ خاک ہو گیا مگر اپنے کارہائے نمایاں کی یادوں کو ایک صدقہ جاریہ کی طرح ہمیشہ کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ حضورِ انور ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمتِ اقدس میں لکھا ہوا اس کا ذکرِ خیر پیشِ خدمت ہے۔ حضور نے ازراہِ شفقت اس تعزیتی مضمون کو قبول فرماتے ہوئے دعائیہ جوابی خط سے بھی نوازا جس کا عکس آخر میں درج ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے اور ہر رنج و ملال میں اسی کا دامن تھامے، اپنے نہایت عزیز دوست اور چھوٹے بھائی، عزیزی ڈاکٹر صلاح الدین مرحوم کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور اس کے اوصاف و محاسن بیان کرنے کی سعادت پا رہا ہوں جو فی ذاتہٖ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ اور مشعلِ راہ ہیں۔

ربوہ سکول میں وہ مجھ سے دو ایک سال جونیئر تھا، اس لیے وہاں اس کے ساتھ سرسری سا تعلق تھا۔ مگر 1988 سے امریکہ میں میرا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ــــــ اور وہ لمحہ تو گویا میری زندگی کا ما حصل بن گیا جب 1991 کے ڈیٹرائٹ میں منعقد ہونے والے جلسہ سالانہ کے اختتام پر ہم سب لوگ سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کو الوداع کر رہے تھے کہ اچانک حضورؒ نے فرمایا:

"آئندہ امریکہ میں لنگر چلنے چاہئیں۔" اس پر بعض منتظمین معذوری کی توجیہات پیش کرنے لگے تو آپؒ نے فرمایا: "اگر تنبوقنات میں جلسہ کی اجازت مل سکتی ہے تو لنگر بھی چل سکتا ہے۔"

خدا جانے وہ کیا لمحہ اور کیا الٰہی تصرف تھا کہ میں نے یکبارگی ہاتھ کھڑا کر دیا اور بول اٹھا: "جی حضورؒ، انشاءاللہ ضرور لنگر شروع کریں گے۔" دوسری طرف کھڑے ہوئے صلاح الدین نے بھی بلا تامل لبیک کہی۔

حضورؒ کے رخصت ہوتے ہی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور اس یقین کا اظہار کیا کہ اب جلسہ سالانہ پر لنگر مسیحِ موعودؑ کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہو سکتی —— یہ دو اٹھے ہوئے ناتواں ہاتھ اور بے مایہ آوازیں اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

صلاح الدین نے اس کار ہائے نمایاں کے لیے ربع صدی سے زائد عرصہ میں کہاں کہاں کوہ کنی کی، کیسی کیسی تیشہ زنی کی، اس کا مختصر تذکرہ پچھلے سال میں نے اپنے مضمون "امریکہ میں لنگر کے پچیس سال" میں ایک عاجزانہ سے رنگ میں کرنے کی کوشش کی تھی —— مگر حقیقتاً اس کا کچھ حصہ بھی صلاح الدین کی ان عظیم خدمات اور انتھک کاوشوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ جس طرح میرے جیسے کم مایہ، بے ہنر اور ناکارہ ساتھیوں کو اس سفر میں لے کر آگے بڑھا، اور ایک کوہ کن کی طرح مصائب کے پہاڑوں اور مشکلات کی چٹانوں سے ٹکراتا اور ایک جوہری کی طرح ہمیں تراشتا رہا وہ ایک داستان ہی اور ہے۔ اس پس منظر کا ایک دلچسپ واقعہ برادرم عزیزم صاحبزادہ میاں ظاہر مصطفیٰ احمد نے مجھے اس کی نماز جنازہ سے فراغت کے بعد کچھ یوں بتایا:

1992 کے اوائل میں جلسہ کے موقع پر اپنا لنگر چلانے کے لیے ایک میٹنگ حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ امریکہ کے گھر پر منعقد ہوئی جس میں اکابر منتظمین کی اکثریتی رائے یہی تھی کہ اپنا لنگر چلانا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ جب سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو صلاح الدین نے، جو اس وقت نیو یارک جماعت کا ضیافت سیکریٹری تھا اور ہزار بارہ سو مہمانوں کا کھانا بنانے کا تجربہ رکھتا تھا، کچھ عرض کرنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر اس نے اپنا تعارف کرایا اور لنگر کی ڈیوٹیوں کا حوالہ دے کر کہنے لگا:

"میاں صاحب، یہ جو سب مخالفت کر رہے ہیں، انہوں نے کبھی انڈہ بھی نہیں تلا۔ انہیں کیا علم، لنگر چلانا کیا ہوتا ہے۔ آپ مجھے موقع دیں، انشاءاللہ یہ کام کر کے دکھاؤں گا۔"

حضرت میاں صاحب کی طبیعت پر بہت بوجھ تھا کہ ایک طرف خلیفۂ وقت کا ارشاد ہو اور دوسری طرف مجبوری و معذوری کی آوازیں بلند ہو رہی ہوں۔ میٹنگ کچھ مایوسی کے رنگ میں ختم ہو گئی۔ سب لوگ باہر نکل آئے

تو آپ نے اپنے خادم صدیق کو بھیجا کہ وہ جو سب سے لمبا نوجوان ہے اسے بلا کر لاؤ۔ اس وقت میاں صاحب مرحوم صلاح الدین کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ فرمانے لگے: "تم یہ کام کر لو گے؟" "خدا تعالیٰ کے فضل اور مدد کے ساتھ، انشاءاللہ ضرور۔" صلاح الدین کا جواب تھا۔

"تو پھر وعدہ کرو کہ دنیا میں جہاں بھی ہو، امریکہ کے جلسہ پر ضرور پہنچو گے۔" صلاح الدین نے وعدہ کیا اور پھر اپنی موت تک اسے نبھایا۔ وہ جاپان میں ہو، جزائر غرب الہند (Caribbean Islands) میں ہو، انگلینڈ میں ہو یا پاکستان، ہر جلسہ پر امریکہ پہنچا۔

حضرت میاں صاحب مرحوم نے بھی اس کی قدر کی۔ اور اپنی زندگی میں ہمیشہ جلسہ پر پہنچنے کے بعد لنگر تشریف لاتے اور صلاح الدین کا شکریہ ادا کرتے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے منہ بولے بیٹے، میاں ظاہر احمد نے بھی اس روایت کو جاری رکھا اور ہمیشہ لنگر آکر صلاح الدین کا شکریہ ادا کیا اور اسے یاد دلایا کہ "تمہیں ابا جان مرحوم کا سلام پہنچانے اور شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

جلسہ کے ابتدائی سالوں میں ایک بار جلسہ سے کچھ عرصہ پہلے اسے پاکستان جانا پڑا۔ ان دنوں اس کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا اور مالی لحاظ سے بھی کافی تنگ دستی کا عالم تھا۔ ایک شخص نے اس کے ایک گہرے دوست سے پوچھا: "صلاح الدین اس دفعہ جلسہ پر آ بھی سکے گا یا نہیں؟" وہ دوست جو اس کا بڑا بھیدی تھا، کہنے لگا:

"وہ جلسہ پر ضرور پہنچے گا، چاہے اسے اپنے کپڑے بیچ کر واپسی کا ٹکٹ خریدنا پڑے۔"

اور حقیقت بھی یہ ہے، اس نے کبھی جلسہ اور اس کی ڈیوٹیوں سے محرومی کا داغ اپنے ماتھے پر نہیں لگنے دیا۔ دو سال پہلے آنکھوں میں آنسو لیے، جذبۂ تشکر و افتخار سے بھرے ہوئے بڑے گھمبیر لہجے میں کہنے لگا:

"امتیاز، آج میں بہت خوش ہوں۔ بحمد للہ مجھے جلسہ کی ڈیوٹیاں دیتے ہوئے پورے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ دس سال کا تھا جب پہلی بار پانی پلانے کی ڈیوٹی دی تھی۔ پھر ربوہ ہو، لندن یا امریکہ، کبھی جلسہ کی ڈیوٹی سے محروم نہیں رہا۔"

خدا تعالیٰ نے صلاح الدین کو جن بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا، ان میں علم، ذہانت، عزم، اپنے مقصد سے لگن، اعلیٰ معیار کے نظم و ضبط اور سخت محنت کی عادت تھی۔ لیکن جو چیز ان سب پر بھاری تھی وہ خلافت اور امارت سے انتہا درجہ کی وابستگی، اطاعت اور توکل و قناعت کے ساتھ دعاؤں پر یقین تھا۔ اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے مقدس مشن کی ادائیگی اور تکمیل کے لیے جنون کی حد تک وفا کے ساتھ قائم ہونا تھا۔

اپنے علم، تجربے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ دینی دنیاوی ہر دو لحاظ سے ارفع مراتب کا اہل قرار دیا جا سکتا تھا اور جماعت کے اعلیٰ عہدوں کا حقدار سمجھا جا سکتا تھا، مگر اس کی عاجزی اور انکساری نے اسے ہمیشہ خاک نشیں رکھا اور دیگوں کی جھلستی آگ ہی میں اپنے لیے راحت و عافیت جانی ——— مگر اس کے پیچھے جو حکمت اور راز تھا اس سے شاید ہر کوئی واقف نہیں۔ اس میں ایک ایسا پختہ ایمان تھا کہ انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے ہماری جماعت اس وقت جس مقام پر فائز اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی وارث بنی ہوئی ہے وہ ثمر ہے ہمارے آقا و محسن سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی اس عاجزی، انکساری، توکل اور قناعت کی قبولیت کا کہ کبھی آپؑ دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑوں پر گزارہ کرتے تھے اور آج بادشاہ آپؑ کے کپڑوں سے برکت حاصل کرنے کو ترستے ہیں اور دنیا کے ملک ملک میں آپؑ کے نام کے لنگر چل پڑے ہیں۔

"لُفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ کَانَ اُکُلِیْ - وَ صِرْتُ الْیَوْمَ مِطْعَامَ الْاَهَالِیْ"

(دستر خوانوں کا پس خوردہ میری خوراک تھا اور آج مَیں کئی گھرانوں کو کھلانے والا بن گیا ہوں)

آقا علیہ السلام کی اس قربانی کی قدر کے لیے صلاح الدین کے اندر ایک ایسا عشق اور جذبۂ تشکر تھا کہ وہ خود تو لنگر میں زمین پر گرے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر کھاتا اور دوسروں کی چھوڑی ہوئی جوٹھی کٹوریوں سے پیٹ بھرتا، مگر مسیح پاکؑ کے مہمانوں کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر طعام تیار کرتا۔ اسی بنا پر وہ جلسہ سالانہ پر لنگر مسیح موعودؑ سے بڑھ کر کسی اور ڈیوٹی کے لیے اپنے

آپ کو تیار ہی نہ کر پاتا تھا۔ اس خدمت کے لیے اس نے جس طرح اپنی زندگی تج دی اس کا ایک ایک لمحہ زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کا لب لباب یہی ہے کہ اس کی فطرت میں اعلیٰ معیار اور بچت کا ایسا حسین امتزاج تھا جس کی مثال کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ مسیحِ موعودؑ کے مہمانوں کے لیے انتہائی اعلیٰ کوالٹی کی اشیا کا انتخاب کرتا اور اسراف سے اس طرح بچتا گویا ایک زہریلے سانپ کے زہر سے تریاق نکال رہا ہے۔ دُور کی قوسوں کو کھینچ کر ایک مختصر سے وَتر میں پروتے ہوئے مَیں نے اس سے بڑھ کر کسی شخص کو نہیں دیکھا۔

سائنسی علوم کی وسعت اور عامیانہ برتاؤ (street knowledge) اس میں اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ کوئی کتنا ہی تجربہ کار، عالم یا شاطر ہوتا اسے مات نہیں دے سکتا تھا۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والے بڑے بڑے گھاگ بزنس مین اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جہاں ان کی قوتِ خرید (buying power) کی انتہا ہو جاتی وہاں سے صلاح الدین کام شروع کرتا تھا۔ اس کے لیے اس نے جس طرح چلچلاتی دھوپوں اور یخ بستہ راتوں میں محنت کی یہ اسی کا کام تھا۔ آدھی رات کے بعد دوڈھائی بجے سبزی منڈی کھلنے سے پہلے وہاں موجود ہوتا اور بھاؤ تاؤ کر کے سب سے اچھا مال سب سے کم قیمت پر خریدتا۔

ایک بار اپنی بیماری کے باعث خود منڈی نہ جا سکا اور دو نوجوانوں کو جو خود بڑے لمبے عرصے سے اس کاروبار میں تھے فون پر ہدایات دیتا رہا۔ ایک موقع پر انہوں نے جواب دے دیا کہ اِس سے زیادہ سستا مال نہیں مل سکتا۔ کہنے لگا: ”تم نے ساری منڈی کا چکر لگا لیا ہے اور قیمتوں کا خوب اندازہ ہو چکا ہو گا۔ اب واپس پہلے ساہوکار کے پاس جاؤ اور اسے کہو، ہمیں ٹماٹروں کے سائز سے کوئی غرض نہیں، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ کیونکہ ہمیں تو مشین میں پیس کر ان کا پیسٹ بنانا ہے۔ تم اگر سائز کے مطابق چھانٹی کرتے رہے اور دیر ہو گئی تو یہ ضائع ہونا شروع ہو جائیں گے۔ آدھی قیمت دیتے ہیں، سارا مال اٹھوا دو۔“

وہ تاجر اس سودے پر راضی ہو گیا۔

امریکہ میں لنگر شروع ہوتے ہی صلاح الدین نے ربوہ، لندن اور کینیڈا کے دورے کیے۔ وہاں کے سسٹم، دیگوں کے سائز اور افرادی قوت (man power) کا بڑے سائنٹیفک طریق پر جائزہ لیا اور حساب لگا کر یہ نتیجہ نکالا کہ اگر ہم دیگوں کا سائز بڑا کر لیں جسے ایک رضاکار آسانی سے ہینڈل کر سکتا ہو تو ہم وقت، محنت اور پیسے کی کتنی بچت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں دیگوں کے حجم اور ساخت کے باعث ان میں بیرونی ممالک اور پاکستان کے نائیوں کی دیگوں سے تین گنا زیادہ مقدار میں کھانا پکایا جا سکتا ہے۔ ہماری دال کی ایک دیگ سات آٹھ سو مہمانوں کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور دس بارہ تربیت یافتہ کارکنان بڑی آسانی سے دس ہزار افراد کا کھانا تیار کر لیتے ہیں۔

صلاح الدین کی انہیں انتھک کوششوں اور خداداد صلاحیتوں کو ربِّ کریم نے اس طرح نوازا کہ جلسہ پر لنگر شروع ہونے کے پہلے ہی سال ہزاروں ڈالر کی بچت ہو گئی۔ بیرونی ذرائع سے خوراک رسانی (catering) پر ہم جو سات آٹھ ڈالر فی کس خرچ کرتے تھے وہ لاگت کم ہو کر صرف 69 سینٹ فی کس پر آ گئی۔ اس طرح ربع صدی میں بحمد للہ جماعت کا کروڑہا روپیہ بچا لیا گیا۔

صلاح الدین اپنے مزاج میں بے تکلفی، سادگی اور عاجزی کے باوجود صحیح مؤقف پر ڈٹ جانے والا اور جماعتی فنڈز کے کسی بھی قسم کے اسراف یا ضیاع پر مصالحت کرنے والا وجود نہیں تھا۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی انتہائی سادہ اور عاجزانہ رکھ رکھاؤ کے باوجود بڑا سخی اور فیاض شخص تھا۔ کسی کو مشورہ کی ضرورت ہو یا عملی مدد کی، ہمیشہ پیش پیش رہتا۔ کئی جماعتوں کو ساز و سامان کی خریداری میں اس نے ہزاروں ڈالرز کی بچت کرائی۔ اور عام حاجتمندوں کی بھی بڑی خاموشی سے اپنی حیثیت اور اوقات سے بڑھ کر مدد کرتا۔ پیسے کی بچت کرنے کے لیے اپنی پرانی سی ٹوٹی پھوٹی کار کی خود ہی مرمت کرتا رہتا۔

ایک بار ایک دوست کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور بجائے ٹول والی ٹرن پائیک لینے کے ذرا دیر سے پہنچانے والے رستے پر ہو لیا تو اس کا دوست اس کے سر ہو گیا:

”صلاح الدین، تم بھی خوب آدمی ہو۔ اٹھارہ ڈالر کی تو بات تھی، کتنا وقت بچ جاتا؟“ کہنے لگا:

"تمہیں نہیں پتا، مَیں ایک ایک پیسہ بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مَیں نے کئی پڑھنے والے بچوں کے وظیفے مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ اٹھارہ ڈالر وہاں صرف ہو سکتے ہیں۔"

یہ بھی الٰہی تصرف اور حکمت دکھائی دیتی ہے کہ اِمسال پہلی بار MTA-USA کی لائیو نشریات سے اس کا انٹرویو نشر کیا گیا۔ اسی طرح دیگوں سے اٹھ کر میلے کچیلے سالن بھرے لباس میں سٹوڈیو پہنچ گیا۔ کسی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب قمیص تو بدل لیں۔ کہنے لگا: "انٹرویو لینا ہے تو اسی طرح لو۔ یہ لباس ہی میرا سرمایۂ افتخار ہے۔ میں دکھاوے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" پھر اس بات پر اڑ گیا کہ جب تک امتیاز میرے ساتھ نہیں ہو گا، انٹرویو نہیں دوں گا۔ جس شخص نے پہلے دن سے میرا ساتھ دیا ہے، مَیں اس کے بغیر ٹی وی پر نہیں آسکتا۔

اب سب لوگ مجھے ڈھونڈ رہے تھے اور مَیں چھپتا پھر رہا تھا کہ کسی طرح سامنے نہ ہی آؤں تو بہتر ہے۔ بالآخر اس نے مجھے پکڑ لیا اور کہنے لگا: "تم مجھ سے بڑے ہو، مَیں تمہیں حکم نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر تم نہیں آؤ گے تو مَیں بھی انٹرویو نہیں دوں گا۔" اس پر مجبوراً مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا کہ کہیں ہم دونوں حکم عدولی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

اپنے مقصد سے لگن اور ڈیوٹی کی ادائیگی کی راہ میں اس کے سامنے کیسی ہی پہاڑوں جیسی مشکلات آجاتیں، کبھی اس کے قدم نہ ڈگمگاتے۔ کئی سال پہلے ایک ذراسی بے احتیاطی سے اس کا پاؤں ابلتی ہوئی دیگ میں جا پڑا۔ پاؤں کی ساری کھال اور گوشت مکمل طور پر بُھن گیا۔ ہڈیاں تک نظر آنے لگیں، مگر اپنے میدان سے ہٹا نہیں۔ بہت زور دیا کہ ہسپتال لے جائیں، نہیں گیا۔ شدید کرب میں وہیں کرسی پر بیٹھا ڈاکٹر آغا شاہد خان سے مرہم پٹی کرواتا رہا اور دیگوں کی نگرانی کرتا رہا۔

یہ ایک عزم تھا، ولولہ تھا خلافت سے انتہائی وابستہ مسیحِ پاک علیہ السلام کے ایک عاجز اور بے لوث غلام کا جس کی ذہانت اور یادداشت ایسی کہ خلیفۂ وقت سے اظہارِ تشکر و امتنان کا تمغہ لے گیا جب سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے Revelation, Rationality, Knowledge and Truth میں بعض حوالوں کی فراہمی پر اظہارِ خوشنودی فرما کر اسے ہمیشہ کے لیے اَمر کر دیا۔ اس کا علم ایسا کہ بڑے بڑے عالم اس کا دم بھریں۔ اس کا تجربہ ایسا کہ بڑے بڑے جغادری ماہرین اسے چیلنج نہ کر پائیں۔ اس کی قیادت ایسی کہ ہم جیسے بیسیوں بے ہنر، اناڑی اور ناکارہ کارکنوں کو کام کا سلیقہ اور حوصلہ عطا کر گیا۔ اس کا مسیح موعودؑ کی صداقت پر ایمان اور خلافت سے وابستگی اور اطاعت کا معیار ایسا کہ رشک آئے ——— مگر ایک بات جو اس کی افتادِ طبع کے باعث شاید عام لوگوں کے علم میں نہ ہو یا وہ اس کا اظہار صرف مجھ سے ہی کیا کرتا تھا ——— وہ دعاؤں پر ایسا کامل اور غیر متزلزل یقین تھا کہ مجھے بھی حیران کر دیتا تھا ——— اور اس کا اظہار وہ آخری

وقت میں کر بھی گیا جب جلسہ 2017 کے اختتام پر لنگر کے ورکرز کی گروپ فوٹو کے بعد صلاح الدین نے غیر متوقع طور حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے بڑے جذباتی رنگ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک طمانیت اور مسرت کا اظہار کیا کہ اس بار اس نے ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے ہمیں سرخرو کیا ہے اور کوئی بھی شکایت سامنے نہیں آئی۔ اس کے ساتھ تمام ساتھیوں سے معافی مانگتے ہوئے یہ عہد کیا کہ "خدا تعالیٰ مجھے زندگی کے آخری سانس تک لنگر میں کام کرنے اور مسیح موعودؑ کے مہمانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور جب مَیں خدمت کرتے ہوئے مروں تو وہ میری زندگی کا آخری جلسہ ہو۔"

صلاح الدین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور تمام حاضرین بھی آبدیدہ تھے۔ لنگر کے ماحول میں اس قسم کی جذباتی فضا مَیں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میرا دل اسی وقت پکڑا گیا کہ یہ آج باتیں کیسی کر رہا ہے۔ لیکن کیا پتا تھا کہ وہ اپنا عہد نبھانے ہی کی نہیں، عہد کی تکمیل کا بھی عندیہ دے رہا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ وہ اپنی وفات سے دو روز قبل مسجد "بیت الرحمٰن" میں لجنہ کے ریجنل اجتماع کی ضیافت کے انتظامات کے لیے ہدایات دیتا رہا اور بیماری کے آخری حملے سے تھوڑی دیر پہلے تک ہمارے لنگر کے پرانے ورکر اور گوشت سپلائی کرنے والے نیو جرسی کے وسیم ملک اور لنگر ضیافت کی سروس کے انچارج عثمان گھمن سے فون پر یہی گفتگو کر رہا تھا کہ لندن، جرمنی اور کینیڈا کے جلسوں کے لیے بھی گوشت کی سپلائی کا معیار اعلیٰ کرنے کے لیے انعام الحق کوثر صاحب کے روابط کو بھی استعمال کر کے ہمیں خود آسٹریلیا جا کر وہاں کے حلال گوشت کے سپلائرز سے براہِ راست رابطہ قائم کرنا چاہیے تاکہ ان سے اپنے معیار اور ضروریات کے مطابق سپلائی کی پیکنگ کروائی جا سکے۔

یہ وہ شخص تھا جو ایک سچے عشق، جنون، دُھن اور جذبے (passion) کے ساتھ ساری زندگی سیّدنا حضرت اقدس مسیحِ موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مہمانوں کی خدمت کے لیے جُتا رہا۔ اس کے اندر وہ دیوانگی تھی جسے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے "مقصود مرا پورا ہو اگر مل جائیں مجھے دیوانے دو" میں تلاش کیا تھا۔ یہ آقا علیہ السلام کے ان غلاموں میں سے تھا جو اپنی بے لوث خدمات سے شکر و عجز سے جھکے ہوئے سروں کو سربلند کر گیا اور حضور علیہ السلام کی روح کو طمانیت عطا کرنے والوں اور یقین دلانے والوں میں شامل ہو گیا کہ آپؑ کے بعد آنے والے بھی آپؑ کی رہنمائی اور عطا کردہ راہوں پر چلتے ہوئے خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کے مقدس مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

خدا تعالیٰ عزیزی صلاح الدین کو غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین مقام عطا فرمائے۔ وہ حقیقتاً ایک عہد ساز وجود تھا جو نہ صرف اپنا عہد نبھا گیا بلکہ زندہ افراد اور زندہ قوموں کی طرح اپنی Legacy اور میراث اس رنگ میں چھوڑ گیا کہ اس کے تربیت یافتہ جانشین اس سے بڑھ کر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ انشاء اللہ العزیز۔

اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے ہمیں پہلے سے بڑھ کر مقبول خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔
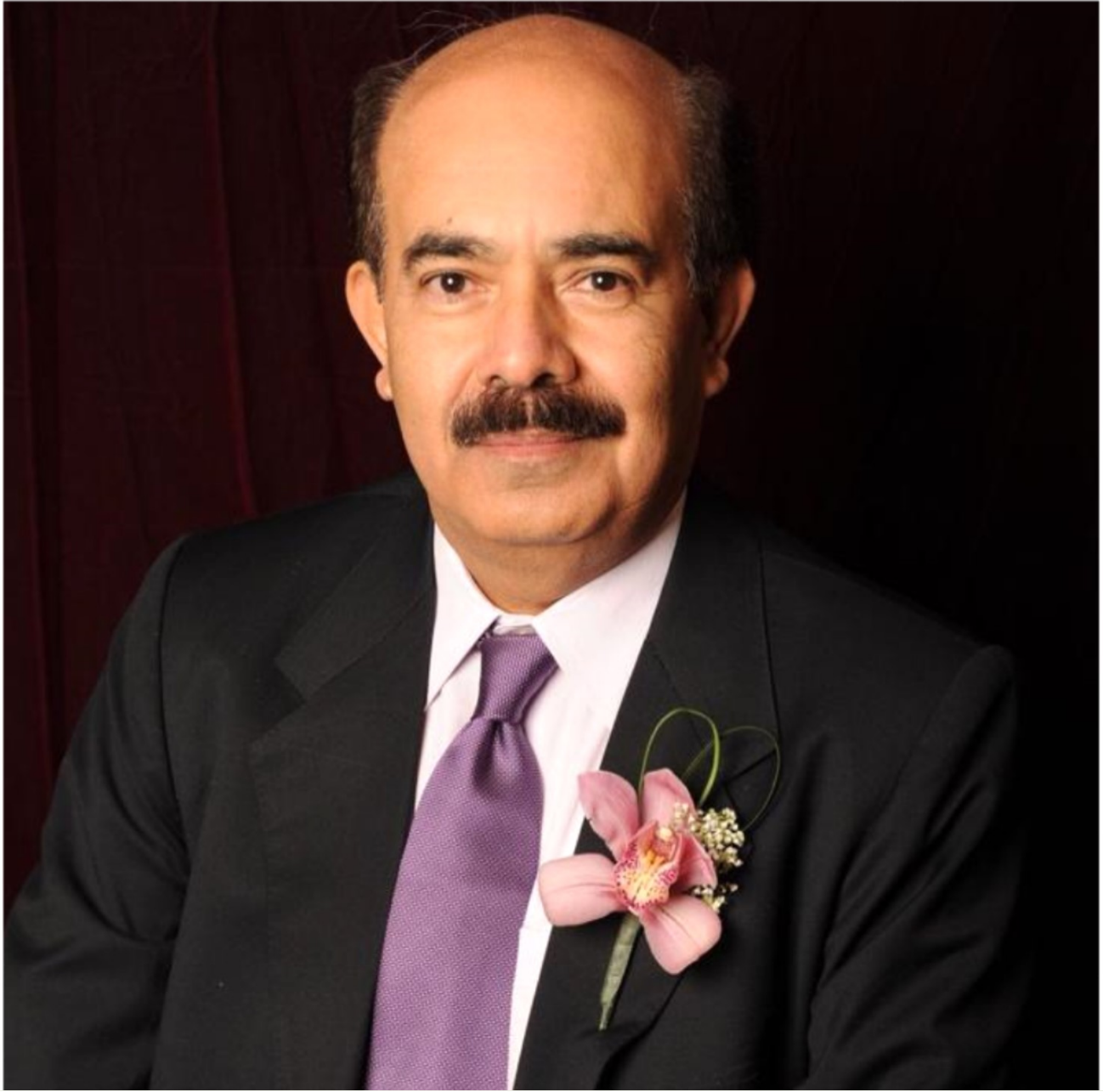
ڈاکٹر صلاح الدین مرحوم

2017—1953

میاں لطف الرحمن محمود صاحب (مرحوم) کا ذکرِ خیر

انجینئر محمود مجیب اصغر، ربوہ

میاں لطف الرحمان محمود

آپ تعلیم الاسلام ربوہ کے نامور طلباء میں سے تھے اور کالج میگزین "المنار" کے بہت اعلیٰ پائے کے ایڈیٹر تھے۔ آپ 19 جولائی 1938ء کو پیدا ہُوئے۔ آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے 1955ء میں میٹرک کیا اور 1955ء سے 1959ء تک تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے۔

اس کے بعد غالباً BEd یا B.T کی ڈگری لی اور تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ میں سائنس ٹیچر رہے۔ آپ بہت اچھے لکھاری اور مقرر اور خدمتِ دین کی تڑپ رکھنے والے متقی انسان تھے۔

در جوانی توبہ کردن شیوہء پیغمبری

کے مصداق تھے اور مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ ربوہ میں عاملہ کے رکن کے طور پر خدمت کی توفیق پائی۔ خدام الاحمدیہ کے ترجمان رسالہ "خالد" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ کے نہائیت قیمتی مضامین خالد اور المنار اور پھر الفضل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ایک لمبا عرصہ آپ سیرالیون میں واقف زندگی ٹیچر کے طور پہ خدمت کی توفیق پاتے رہے اور بالآخر بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے اور امریکہ جاکر اپنے بھائیوں کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

میں اِنہیں بچپن سے جانتا تھا۔ میں ان سے بہت جونیئر تھا لیکن

شروع سے ہی اُن سے متاثر تھا۔

ہمارے بچپن میں مسجد نور بھیرہ میں اُنہوں نے چند بار اطفال الاحمدیہ کے اجلاس کروائے جن میں، میں بھی بطور طفل شامل ہوتا تھا۔ اس لئے اُس وقت سے اُن کا غائبانہ طور پر عقیدت مند ہو گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی علمی خدمات سامنے آتی گئیں اس سے میری عقیدت

بڑھتی چلی گئی۔ میری باقاعدہ ملاقات اُن سے خلافت لائبریری میں اُس وقت ہوئی جب وہ چند سال پہلے امریکہ سے ربوہ آئے ہوئے تھے اور اُن کے ایک نسبتی پوتے کی شادی تھی۔ خلافت لائبریری میں مربّی فضل احمد صاحب شاھد (کشمیری) نے ان سے ملاقات کروائی اور وہ ان دنوں بعض حوالے تلاش کر رہے تھے۔ شادی میں بھی مجھے شریک کیا۔ اور بھیرہ کے تعلق اور اُن کے والد محترم اور میرے والد محترم کے بچپن کے تعلق کی وجہ سے اپنی اپنایت سے اور محبت سے گفتگو کرتے رہے۔

ان کی وفات پر مربی فضل احمد شاہد صاحب (کشمیری) کی ہی تحریک پر میں نے اُن کے خاندانی پسِ منظر اور جو حالات و کیفیات مجھے معلوم تھیں پر مبنی ایک Fax حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کا ذکر حضور انور نے اپنے خطبہ جمعہ مورخہ 9جون 2017ء میں فرمایا:۔ (الفضل انٹرنیشنل لندن 30جون۔6جولائی 2017ء)

''انسان کی پہچان اس کے آباو اجداد سے ہوتی ہے۔ میاں لطف الرحمن محمود صاحب کے آباو اجداد کا بھیرہ کی تاریخ احمدیت میں اس طرح ذکر ملتا ہے۔

خاندانی پس منظر: تاریخِ احمدیت بھیرہ مصنف میاں فضل الرحمن بسمل غفاری بی اے بی ٹی امیر جماعت احمدیہ بھیرہ (اشاعت 1972ء) کے مطابق لطف الرحمن محمود صاحب کے دادا جان کا ذکر اس طرح ہے۔

حضرت میاں کرم دین صاحب (صحابی)

(ولادت 1870ء، بیعت 1894ء، وفات 1928ء)

آپ مکرم پروفیسر میاں عطا الرحمن صاحب ایم ایس سی۔ وائس پرنسپل ٹی آئی کالج ربوہ کے والد ماجد تھے۔ احمد آباد (جہلم) سے ہجرت کر کے بھیرہ آئے اور محلہ احمدیہ میں آباد ہوئے۔ بڑے مخلص بزرگ تھے۔ حضرت مسیح موعودؑ کے صحابی تھے خاموش طبع، دیانت دار اور محنت کش انسان تھے، سلسلہ کے کاموں میں سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔

(رجسٹر روایات میں آپ کی ایک بیٹی کی روایت درج ہے جس کا ذکر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایداللہ تعالیٰ نے 9جون 2017ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا ہے)

میاں لطف الرحمن محمود صاحب کے والد محترم

مکرم میاں عطاء الرحمن صاحب ایم ایس سی بی ٹی

(ولادت 1905ء وفات جنوری 1982ء)

پہلے آپ گورنمنٹ کالج شاہ پور میں لیکچرار تھے۔ قادیان میں کالج بننے پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے تحریک فرمائی کہ مستند اساتذہ زندگی وقف کرکے قادیان میں آئیں۔ آپ نے فوراً سرکاری ملازمت چھوڑ کر قادیان آنے کی پیشکش کی۔ مرکز نے بلایا تو استعفیٰ دے کر چل کھڑے ہوئے۔ مگر مرکز کو کوئی اور آدمی مل گیا۔ اس لئے آپکو استعفیٰ واپس لینا پڑا۔ جب واپس لے چکے تو پھر مرکز نے بُلا بھیجا آپ نے پھر استعفیٰ دیا۔ اگرچہ افسران نے اِن کے اس فعل کو نا

پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا مگر میاں صاحب کو سلسلہ کی خاطر سب کچھ منظور تھا۔ چنانچہ آپ قادیان چلے گئے اور بڑی دیانتداری اور تن دہی سے خدمات سر انجام دیتے تھے۔ آپ ہمیشہ سبق کی تیاری کر کے کلاس میں جاتے تھے۔ آپ کے پڑھانے کا طریق جاذب اور دلنشین تھا۔ آپ بہت نیک اور ذہین تھے۔

ایک دفعہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ چاند گرھن کے بعد پھر روشن ہو گیا بے ساختہ بولے !!

کروں گا دُور اس مہ سے اندھیرا
دکھاؤں گا کہ اک عالم کو پھیرا

تفہیم ہوئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ حضرت محمود احمد صاحب خلیفہ منتخب ہوں گے۔ بعض لوگ اختلاف کریں گے مگر ماننے والے ترقی کریں گے۔۔۔۔۔۔

میاں صاحب کے بڑے صاحبزادے لطف الرحمن محمود مغربی افریقہ میں سلسلہ کے مدارس میں استاد ہیں عمدہ طور پر دین کی خدمت کر رہے ہیں۔

اور دوسرے فرزند لطف المنان صاحب ایم ایس سی آجکل پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ گئے ہیں۔

(بھیرہ کی تاریخ احمدیت ص91، ص92)

افراد خاندان میاں لطف الرحمن محمود صاحب

ان کے بھائی میاں شفیق الرحمن صاحب آرکیٹکٹ انجینئر کے مطابق ان کے اہل و عیال کی تفصیل درج ذیل ہے !!

ضیاء خاور محمود (اھلیہ)
انعام الرحمن (بیٹا)
منورہ سلطانہ (بیٹی)
لطف القدوس محمود (بیٹا)
ہشام محمود (بیٹا)
ھبۃ النور محمود (بیٹی)

آپ کے بہن بھائیوں کی ترتیب یہ ہے !!

1۔ لطف الرحمن محمود
2۔ امۃ اللطیف (بہن)
3۔ لطف المنان (بھائی)
4۔ امۃ الرفیق (بہن)
5۔ حبیب الرحمن مرحوم (بھائی)
6۔ شفیق الرحمن (بھائی)
7۔ امۃ النصیر (بہن)
8۔ امۃ السمیع یاسمین (بہن)

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہٖ العزیز کے الفاظ میں دُعا ہے کہ۔۔۔ ”اللہ تعالیٰ اِن سے مغفرت اور رحم کا سلوک فرمائے۔ درجات بلند فرمائے اور ان کی اولاد کو بھی ان کی نیکیوں کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔“ آمین

مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج
یو۔ ایس۔ اے کے زیر اہتمام
اُردو کے نامور اور مایہ ناز شعراء کے ساتھ

TALIM - UL - ISLAM COLLEGE ALUMNI ASSOCIATION USA
عِلْم عَمَل

شعری نشست

13 اگست 2016 بروز ہفتہ SHAHEEN RESTAURANT
1111N. Rolling Road, Catonsville (Baltimore) MD

فہمیدہ ریاض | سرمد صہبائی | شہلا نقوی | عباس تابش | مقصود وفا | شوکت فہمی | احمد مبارک

محترمہ فہمیدہ ریاض، جناب سرمد صہبائی، محترمہ شہلا نقوی، جناب عباس تابش،
جناب مقصود وفا، جناب شوکت فہمی، جناب احمد مبارک، جناب سعید نقوی اور محترمہ مونا شہاب

داخلہ: بذریعہ ٹکٹ 25 ڈالر فی کس (مشاعرہ و ڈِنر)

ڈِنر: 6:30 تا 7:30 — مشاعرہ 7:30 تا 10:00 بجے شب

ٹکٹ اور مزید معلومات کے لیے درج ذیل منتظمین سے رابطہ کریں

ڈاکٹر صفی اللہ چوہدری 856-305-4401
ناصر جمیل 443-567-1862
سفیر رامہ 703-629-7773

ایک شعری نشست

ناصر جمیل

مؤرخہ 13 اگست 2016 تعلیم الاسلام کالج المنائی یو۔ایس۔اے نے میری لینڈ کے شہر بالٹی مور میں امریکہ میں مقیم شعرا کے علاوہ پاکستان سے تشریف لائے ہوئے اُردو کے نامور شعرا کے ساتھ ایک شعری نشست کا اہتمام کیا۔ ان شعراء میں محترمہ فہمیدہ ریاض، جناب سرمد صہبائی، جناب عباس تابش، محترمہ شہلا نقوی، جناب شوکت فہمی، جناب مقصود وفا نے شمولیت کر کے اس محفل کو رونق بخشی۔ مقامی شعرا میں جناب احمد مبارک، جناب اکرم ثاقب، محترمہ مونا شہاب اور جناب صادق باجوہ نے شرکت کی اور کلام پیش کیا۔ تعلیم الاسلام کالج المنائی کی خصوصی درخواست پر تعلیم الاسلام کالج کے ہی ہر دل عزیز سابق اُستاد اور چیئرمین شعبہ اُردہ جناب ڈاکٹر پرویز پروازی کینیڈا سے تشریف لائے اور شعری نشست کی صدارت کی۔ نظامت کے فرائض جناب احمد مبارک نے ادا کیے۔ جملہ انتظامات اور میزبانی کے فرائض ناصر جمیل، جنرل سیکرٹری المنائی، نے مکرم سفیر رامہ اور صفی اللہ چوہدری، صدر المنائی، کے بھرپور تعاون سے ادا کیے۔

شعری نشست میں شریک مہمان شعرائے کرام

احمد مبارک

میں بھی تھا کر رہے تھے جہاں سارے گفتگو
ہر اک سے اُٹھ نہیں سکا وہ بارِ گفتگو

ٹھہرا دیا گیا ہوں گنہگار گفتگو
حالانکہ کر رہا تھا میں انکارِ گفتگو

پہلے تو کر دیا گیا سب کچھ تہس نہس
پھر ہم پہ دھر دیا گیا آزارِ گفتگو

درکار ایک اور ساعت ہے اس جگہ
سب پر نہیں کھلیں گے یہ اسرارِ گفتگو

بُوے معنی رقص کُناں ہے ہوا کے ساتھ
کس نےِ کھلا دیے گل و گلزارِ گفتگو

تَب کُھل کے مل سکیں گے سرِبزمِ خامشی
ٹوٹے گی جب وہ بیچ کی دیوارِ گفتگو

یوں تو ہیں چُپ مگر میرے جانے کی دیر ہے
بیٹھے ہوئے ہیں سب یہاں تیارِ گفتگو

اس خاکِ رفتگاں پہ سنبھل کر خرام کر
پھیلے ہوئے ہیں جا بجا آثارِ گفتگو

کوئی بُلا کے لاؤ کہ ہے خامشی بہت
جانے کہاں گئے ہیں میرے یارِ گفتگو

وہ خوش بیان جا چکا کر کے سخن تمام
اب تک وہیں کھڑے ہیں طلبگارِ گفتگو

☆☆☆

اکرم ثاقب

وہ شہر رائیگاں بدلا نہیں ہے
غموں کا سائباں بدلا نہیں ہے

مرا نیزے پہ سر رکھا گیا ہے
مگر میرا بیاں بدلا نہیں ہے

سنا ہے بھوک اُگتی ہے لہو میں
سنا ہے باغباں بدلا نہیں ہے

سنا ہے میرے کتبے گر رہے ہیں
کہ راوی داستاں بدلا نہیں ہے

ابھی بھی وقت ہے آجا گلے مل
کہ میں نے کارواں بدلا نہیں ہے

صلیبیں لے کے چلتے ہیں مسافر
کہ ثاقبؔ حکمراں بدلا نہیں ہے

☆☆☆

صادق باجوہ

ڈھونڈ رہا ہوں جس کو میں، پاس ہی ہے یہیں کہیں
چھپ کہ کہاں وہ جائے گا، ایسا نہیں، نہیں نہیں

جس کی تلاش و فکر میں کیا کیا جتن نہیں کیے
مل ہی تو جائے گا کبھی، دل کو یہی تو ہے یقیں

فکر جہاں کے ساتھ ساتھ، اپنی بھی جستجو تو ہو
ڈھونڈو تو دل میں پاؤ گے کوئی تو دل میں ہے مکیں

قصہء دردِ دل ہے کیا، کیوں نہ سمجھ میں آسکا
دم میں نہیں رہا ہے دم یا کوئی آرزو نہیں

اوروں کو دکھ میں ڈال کے دل کو سکوں ملا تو کیا
حسن طلب کی چاہ میں دل کا لہو تو ہو کہیں

چاہے کہیں بھی جایئے، در کوئی کھٹکھٹایے
سنگ حبیب چھوڑ کر جھکتی نہیں کہیں جبیں

چشمِ کرم کا فیض ہے چاہے جسے نواز دے
فُرقت گزیدہ نیم جاں، صادقؔ بھی ہے یہیں کہیں

مونا شہاب

دن ڈھلے گھر سے نـــکـــلـــتـــے ہو کوئی بات تو ہے
تم جو سڑکوں پہ ٹہلتے ہو کوئی بات تو ہے

میں بھی بالوں میں سجا لیتی ہوں ہر شام گلاب
تم بھی خوشبو سے بہلتے ہو کوئی بات تو ہے

دل میں رہتی ہوں مگر اپنے خیالوں میں کہیں
شب گئے نیند میں چلتے ہو کوئی بات تو ہے

باتوں باتوں میں پکڑ کے جو کبھی ہاتھ میرا
بے سبب بات بدلتے ہو کوئی بات تو ہے

سرد راتوں میں کھلی چھت پہ ستاروں کے تلے
موم کی طرح پگھلتے ہو کوئی بات تو ہے

جس طرف چلتی ہے موسم کے لیے نرم ہوا
تم اسی سمت میں چلتے ہو کوئی بات تو ہے

نہ بتاؤ تو کوئی بات نہیں ہے لیکن
تم کسی آگ میں جلتے ہو کوئی بات تو ہے

☆☆☆

ڈاکٹر سعید نقوی

یادِ ماضی کو حوالہ نہ بنایا جائے
اب ضروری ہے کہ اپنوں کو بھی پرکھا جائے

جس کی مٹی میں لہو رنگ ہے ہر موجِ خرد
اس وراثت سے مجھے باز ہی رکھا جائے

ہم تو پرکار سے اب مستطیل کھینچتے ہیں
حدِامکان کے اُس پار بھی دیکھا جائے

یہ جو حالات ہیں یہ ہم نے نہیں رکھے ہیں
ہم کو چادر کے تناسب سے نہ رکھا جائے

وقت رکھ دے کسی آیندہ کے پل میں مجھ کو
جاتے جاتے یہ نیاکام تو کرتا جائے

☆☆☆

نظم

میں نے کل پکاسو کی
یہ مصوری دیکھی
ہونٹ جس میں کالے تھے
اور اس کے سینے پر
آنکھ بھی بنی دیکھی
شاید اک مصور کو
یہ پیام دینا تھا
آدمی بنانے میں
احتیاط لازم ہے۔

☆☆☆

غزل

درو دیوار کا دکھ بعد کا ہے
یہاں تو مسئلہ بنیاد کا ہے

میں اپنے ساتھ بھی چلتا کہاں تک
ہر اک رستہ تمہاری یاد کا ہے

بنا تحریر کہ یہ کورا کاغذ
نیا لہجہ میری فریاد کا ہے

میں کیوں بیٹھا ہوں انکے راستے میں
زمانہ اب میری اولاد کا ہے

نہ گھر کی چھت پہ کوئی آنچ آئے
یہی قرضہ میری بنیاد کا ہے

☆☆☆

نظم

میں زمین پر تنہا چاند تکتا رہتا تھا
چاند کا تمنائی
اسکے لمس کی حدت کی طلب میں رہتا تھا
فاصلوں کے پیمانے دیکھ کر فضاؤں میں

سانس ٹوٹ جاتی تھی
جب میں چاند پر پہنچا
اور زمین کو دیکھا
کتنے فاصلوں پر وہ بدگماں سی بیٹھی تھی
چاند تو وہیں پہ تھا اور زمیں جگہ پر تھی
میری ذات ہی اپنے راہِ ارتقاء میں تھی
فاصلے زمینی ہیں اور نہ آسمانی ہیں
فاصلے تو ہم سے ہیں
سب ہیں اپنے محور پر
چاند بھی مدار میں ہے
میری ذات کا نقطہ
کہاں ہے دائرے میں آج
فاصلوں کے پیمانے
اس قدر چھوٹے ہیں

☆☆☆

شوکت فہمی

اسطرح کے حریف سخت کے ساتھ
کون لڑتا ہے اپنے بخت کے ساتھ

وہ ضرورت تھی یا محبت تھی
بیل لپٹی رہی درخت کے ساتھ

☆☆☆

یوں نہ مٹی سے اٹ گئے ہوتے
ہم جو رستے سے ہٹ گئے ہوتے

ہم نے سب کشتیاں جلا ڈالیں
ورنہ کب کے پلٹ گئے ہوتے

ہم تمہارے اگر نہ ہو پاتے
کتنے ہاتھوں میں بٹ گئے ہوتے

ایسے لشکر سے کتنا بہتر تھا
ہم اکیلے ہی ڈٹ گئے ہوتے

☆☆☆

پیڑوں پہ پرندہ کوئی نہیں
کیا شہر میں زندہ کوئی نہیں

سب آن بسے ہیں بستی میں
جنگل میں درندہ کوئی نہیں

اس شہر میں کون نہیں رُسوا
لیکن شرمندہ کوئی نہیں

☆☆☆

مشکل پڑی توگھری رفاقت بدل گئ
سورج ڈھلا تو سائے کی صورت بدل گئ

اک عمر تک میں اسکی ضرورت بنا رہا
پھر یوں ہوا کہ اسکی ضرورت بدل گئ

☆☆☆

سب میری ذات پر اتر آئے
یار اوقات پر اتر آئے

پہلے میرا ہنر کھنگالا اور
پھر میری ذات پر اتر آئے

رنگ کچے تھے سارے تتلی کے
سو میرے ہاتھ پر اتر آئے

میں دلیلوں سے بات کرتا ہوں
آپ آیات پر اتر آئے

☆☆☆

بات کرنے کا کیا ہُنر آیا
بس یہ سمجھو میں بار بار آیا

کل گیا تھا میں ایک گلشن میں
پھول شاخوں پہ باندھ کر آیا

آئینے پر نظر پڑی یکدم
دیکھا دیکھا کوئی نظر آیا

اُس نے پوچھا کہ کون، فہمیؔ کون
اور میں سیڑھیاں اتر آیا

☆☆☆

مقصود وفا

یوں بھی خاصیتِ اشیاء کا پتہ چلتا ہے
ریت پر چلتا ہوں، دریا کا پتہ چلتا ہے

جینے لگتا ہوں تو مرنے کی خبر ملتی ہے
اسی دوران میں احیاء کا پتہ چلتا ہے

گھر میں ترتیب سے رکھی ہوئی چیزوں سے مجھے
اپنی برباد تمنا کا پتہ چلتا ہے

ہوتے ہوتے تیرے رازوں کی خبر ہوتی ہے
چلتے چلتے تیری دنیا کا پتہ چلتا ہے

☆☆☆

کارِ بیکار سے آگے کا قدم لیتا ہوں
جو بناتا ہوں اسے توڑ کے دم لیتا ہوں

خاک میں ملتا ہوا دادِ فنا دیتا ہوا
بعض اوقات تو میں راہِ عدم لیتا ہوں

ایک دیوار پہ لٹکی ہوئی تصویروں کو
ایسے تکتا ہوں کہ پھر سانس بھی کم لیتا ہوں

بے قراری ہی کچھ ایسی ہے میری مٹی میں
جب بھی مرتا ہوں کوئی اور جنم لیتا ہوں

☆☆☆

گرد اپنی اتارتا ہوں ذرا
یہ شب وروز جھاڑتا ہوں ذرا

کرنے والا ہے اِک ستارہ کلام
تھوڑی دیر اور جاگتا ہوں ذرا

کارِ دُنیا کوئی رعایت کر
فرصتِ خواب چاہتا ہوں ذرا

اب میں اتنا بھی صبر والا نہیں
گاہے گاہے کراہتا ہوں ذرا

اِک تو میں چاہتا ہوں تنہائی
اِک تیرا ساتھ چاہتا ہوں ذرا

☆☆☆

ہم میں سے کوئی ایک ہے پیچھے پڑا ہوا
اِک میں ہوں دوسرا میرے اندر چُھپا ہوا

محتاط رہ کہ خاک اڑانا یہاں ذرا
جلنے کی تاب رکھتا ہے شعلہ بجھا ہوا

کھیلا ہوں موج موج تیرے ہجر سے اور اب
دل کو ہے تیرے وصل کا دھڑکا لگا ہوا

کھڑکی کہ اُس طرف ہے جمالِ تباہ کُن
کھڑکی کے درمیان ہے پردہ لگا ہوا

کچھ اپنے طور سے بھی ہے رستہ ذرا خراب
اور میں بھی راستے سے ہوں کچھ کچھ ہٹا ہوا

☆☆☆

زخم سہلاتے ہیں اور کارِ ہُنر کرتے ہیں
ہم جو بیتی ہوئی عمروں کو بسر کرتے ہیں

ان زمینوں سے بہت دور کسی رستے میں
بیٹھ جاتے ہیں کہیں اور سفر کرتے ہیں

نیند اتنی بھی ضروری نہیں خوابوں کے لیے
آؤ سوئے ہوئے لوگوں کو خبر کرتے ہیں

رائیگاں جائے گا یوں بولتے رہنا اُس کا
ہم مگر چُپ بھی رہیں گے تو اثر رکھتے ہیں

کامیابی کہ علاوہ بھی کئی مقصد ہیں
ہم کوئی کوشش ناکام اگر کرتے ہیں

اور کچھ کرنا نہیں آیا سو مقصود وفآ
اک محبت ہے جسے بارِ دگر کرتے ہیں

☆☆☆

شہلا نقوی

شکستِ ذات کے احساس سے پلٹ آئے
غموں کے درد کے بن باس سے پلٹ آئے

سمیٹ لائے ہیں اپنی تمام کرچوں کو
تمہارے سامنے اک آس سے پلٹ آئے

وہ آنسوؤں کا سمندر تھا قطرہ قطرہ نمک
سوائے میرے سبھی پیاس سے پلٹ آئے

جلی لُٹی ہوئی بستی کے بام و در کی قسم
گئے تھے شوق سے پر یاس سے پلٹ آئے

وہ اور ہیں جو ستاروں پہ ڈالتے ہیں کمند
زمیں کے عشق میں ہم پاس سے پلٹ آئے

☆☆☆

عباس تابش

ہم نے چپ رہ کے جو اک ساتھ نبھایا ہوا ہے
وہ زمانہ میری آواز میں آیا ہوا ہے

غیر مانوس سی خو شبو سے لگا ہے مجھ کو
تونے یہ ہاتھ کہیں اور ملایا ہوا ہے

میں اُسے دیکھ کے لوٹا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
شہر کا شہر مجھے دیکھنے آیا ہوا ہے

☆☆☆

دُہائی دیتا رہے جو دُہائی دیتا ہے
کہ بادشاہ کو اونچا سُنائی دیتا ہے

تو اس سے مانگ رہا ہے فقط غزل کی بھیک
خدا تو مُلکِ سخن کی خدائی دیتا ہے

ہم اس لیے بھی تجھے بولنے سے روکتے ہیں
تو چپ رہے تو زیادہ سُنائی دیتا ہے

☆☆☆

ہر ایک ہاتھ میں پتھر ہیں کیا کیا جائے
یہ آئینے کا مقدر ہے کیا کیا جائے

میں جس کے ہجر سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں
مجھے وہ شخص میسر ہے کیا کیا جائے

کوئی ٹکرا کے سُبک سر بھی تو ہو سکتا ہے
میری تعمیر میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

کیوں نہ اے شخص تجھے ہاتھ لگا کر دیکھوں
تو میرے وہم سے بد تر بھی تو ہو سکتا ہے

یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان
میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ ہم ہار کے جیتیں تابشؔ
عشق کا کھیل برابر بھی تو ہو سکتا ہے

☆☆☆

کوئی ملتا نہیں ہے بوجھ بٹانے کے لیے
شام بے چین ہے سورج کو گرانے کے لیے

میں نے تو جسم کی دیوار ہی ڈھائی ہے فقط
قبر تک کھودتے ہیں لوگ خزانے کے لیے

لفظ تو لفظ یہاں دھوپ نکل آتی ہے
تیری آواز کی بارش میں نہانے کے لیے

کس طرح ترکِ تعلق کا میں سوچوں تابشؔ
ہاتھ کو کاٹنا پڑتا ہے چھڑانے کے لیے

☆☆☆

اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے
ہمارے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے

عجیب لوگ ہیں یہ خاندان عشق کے لوگ
کہ ہوتے جاتے ہیں قتل اور کم نہیں ہوتے

☆☆☆

یہاں پہ عہدہ و منصب قبول کرتے ہوئے
میں تجھ کو بھول گیا تھا یہ بھول کرتے ہوئے

اب اور کتنا جیوں فتح کی امید کے ساتھ
کہ تھک گیا ہوں میں لاشیں وصول کرتے ہوئے

کہ جیسے آندھیاں بارش کو ساتھ لاتی ہیں
وہ رو پڑا مجھے قدموں کی دھول کرتے ہوئے

اب اسکو یاد بھی کرتا ہوں پوچھ کر اُس سے
یہ نوبت آئی ہے شرطیں قبول کرتے ہوئے

☆☆☆

اسی لیے تو ہمارا نشانہ بنتا ہے
ہمارے سامنے آکر زمانہ بنتا ہے

ہمارے جسموں کی اینٹیں لگائی جاتی ہیں
ہمیں ٹھکانے لگا کر ٹھکانہ بنتا ہے

بہشتِ بوسہ اگر تجھ سے مانگتے ہیں ہم
ہم اہلِ شوق کا یہ محنتانہ بنتا ہے

☆☆☆

نمایاں ہونے کہ امکان سے نکل آیا
میں زرد رو شبِ ہجران سے نکل آیا

وہ جس کے خوف سے چھوڑا تھا میں نے بستی کو
وہ سانپ پھر میرے سامان سے نکل آیا

☆☆☆

دی ہے وحشت تو یہ وحشت ہی مسلسل ہو جائے
رقص کرتے ہوئے اطراف میں جنگل ہو جائے

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

حالتِ ہجر میں جو رقص نہیں کر سکتا
اُسکے حق میں یہی بہتر ہے کہ پاگل ہو جائے

ڈوبتی ناؤ میں سب چیخ رہے ہیں تابشؔ
اور مجھے فکر غزل میری مکمل ہو جائے

☆☆☆

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں سُوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم تیرے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اُن کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابشؔ
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں

☆☆☆

رات کو گھر سے نـــکـــلـــتـــے ہوئے ڈر لگتا ہے
چاند دیوار پہ رکھا ہوا سر لگتا ہے

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے

اپنے شجرے کی وہ تصدیق کرائے جاکر
جس کو زنجیر پہنتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اِک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

☆☆☆

سرمد صہبائی

دشت میں ہے ایک نقشِ رہگزر سب سے الگ
ہم میں ہے شاید کوئی محوِ سفر سب سے الگ

چلتے چلتے وہ بھی آخر بھیڑ میں گُم ہو گیا
وہ جو ہر صورت میں آتا تھا نظر سب سے الگ

بند ہیں گلیوں میں گلیاں، ہیں گھروں سے گھر جدا
ہے کوئی اس شہر میں شہرِ دِگر سب سے الگ

سب کی اپنی منزلیں تھیں سب کے اپنے راستے
ایک آوارہ پھرے ہم در بدر سب سے الگ

شہرِ کثرت میں اگر اِک روزنِ خلوت کُھلا
اُس نے جب دیکھا مجھے اک لمحہ بھر سب سے الگ

ان گنت جلووں سے ہیں کون و مکاں روشن مگر
دل کے خاکستر سے اُٹھتا ہے شرر سب سے الگ

ہے راہ و رسمِ زمانہ پردۂ بیگانگی
درمیاں رہتا ہوں میں سب کے مگر سب سے الگ

مستِ پھر باغِ تحیّر میں اے طاغوتِ سُخن
کو بہ کو پھیلے ہیں اس کے بال و پر سب سے الگ

سب کے سب شامل ہوئے سرمدؔ جلوسِ عام میں
منہ اٹھائے چل دیا ہے تو کہاں سب سے الگ

☆☆☆

فہمیدہ ریاض

امن کی آشا

امن کس لیے لائیں
ختم کس لیے کر دیں
یہ اربوں کھربوں کا کاروبار

قائم ہے جنگ کی بدولت
جو ہم نیاز مندوں کا روزگار قائم ہے
ایسے فضلِ ربی کو کیسے مسترد کر دیں
کیونکہ آپ کہتے ہیں
یار آپ بھی ہیں خوب کس جہاں میں رہتے ہیں
ٹھیک ہے کہ اب یہ ملک ہو گیا بہت برباد
مر گئے ہزاروں لوگ اُڑ گئے دھماکوں میں
کیا کریں یہ ہیں مجبور
اِن جدید جنگوں کے دائو پیچ ایسے ہیں
کہ کتنے ہم وطن معصوم اپنی جاں سے جاتے ہیں
ہم تو فاتحہ پڑھ کر اشک بھی بہا آتے ہیں
سب شہید ہیں پیارو، اوروں کو بتاتے ہیں
یہ رضائے ربی ہے
جس کو موت آتی ہے
اس کی موت آنی ہے
یہ جہان فانی ہے
کیا یقین نہیں تم کو
کیسے تم مسلماں ہو
موت زندگی دونوں
ہیں خدا کے ہاتھوں میں
امن کس طرح آئے
خواب ٹوٹ جائیں گے
عیش کے، حکومت کے
رعب داب کے دن رات

جنگجو جوانوں کی۔ کیسی جیت، کیسی مات
جنگ اک تسلسل ہے
جس میں ہے زرِ خالص
کس طرح سمیٹیں ہم جو بساط پھیلی ہے
ہم نے جو بچھائی ہے
ان طویل برسوں میں
اسقدر مشقت سے
جو ہمارے دشمن ہیں
شکر رب العزت کا
وہ بھی کم نہیں ہم سے
جاندار ہیں پٹھے
پینترے بدلتے ہیں
روز چال چلتے ہیں
ہم بھی سوچتے ہیں چال
شہ کو بڑھاتے ہیں
وہ بچاتے ہیں ملکہ
ہم پیادہ لاتے ہیں
اک قدم بڑھیں آگے
سو قدم چلیں پیچھے
جنگ ایک چکی ہے
روز اسے چلاتے ہیں
یہ بھی کیسی لیلیٰ ہے
اسکی تیز گردش سے
اپنے آپ اُگتے ہیں فرقہ واریت کے بیج

پاپ یہ بھی کرنا ہے
سب کا دھیان بٹتا ہے
ورنہ جانے کیاں مانگے
غول بھوکے ننگوں کا

ہم ہیں ایک چمکتا دیش
کہہ رہا ہے امریکہ
رنگ کیوں پڑے پھیکا
ہم بھی سُر ملائیں گے
اس کے بعد وہ ہم کو
چین سے لڑائیں گے
ہر گھڑی وہ رہتے ہیں
جنگ کے لیے تیار
اُن کے دم قدم سے ہے
اپنی گرمئ بازار
بیچ میں پڑے جب ٹھنڈ
دونوں پیلتے ہیں ڈنڈ

آگیا ہے پھر ساون
چل رہی ہے پُرواری
پیڑ میں چھپی کوئل
کُوکتی ہے کچھ ایسے
جیسے وار کرتی ہو سارے عیش و عشرت پر
جنگ سے جو حاصل ہے اور روز افزوں ہے

ٹھہر تو سہی کوئل تو نظر نہیں آتی
ورنہ ایک گولی سے تیرا خاتمہ کر دینگے
جا کہ مہرباں ہیں آج
بخش دی ہے تیری جان
اپنا گیت گائے جا
کیا بگاڑ سکتی ہے تُو ہماری حشمت کا
جب جہاز جھپٹیں گے
تُند رو ہواؤں میں
جب ترانے گونجیں گے جنگ کے فضاؤں میں
جو تمام دانشوران غریب ملکوں کے
مل کے ساتھ گائیں گے
جب ہماری دہشت سے تیری کُوک لرزے گی
تیری کُنج میں سہمی خود بخود سمجھ لے گی
کُوک اور گرج کا فرق
دُور ہو گی خوش فہمی

☆☆☆

ڈاکٹر پرویز پروازی

وقت کی چھلنی میں چھانی جائے گی
تب ہماری بات مانی جائے گی

آبلہ پاؤں کے دل میں ایک دن
بات کانٹوں کی زبانی جائے گی

آنا ٹھہرا ہے بڑھاپا آئے گا
جانا ٹھہرا ہے جوانی جائے گی

☆☆☆

وقت ناوقت ہُوا، جاں پہ بنی رہتی ہے
سر پہ چادر سی اداسی کی تنی رہتی ہے

دل بھی قابو میں نہیں آنکھ بھی قابو میں نہیں
اور ان دونوں میں ہر وقت ٹھنی رہتی ہے

کام ہی اسکو نہیں زہر اگلنے کے سوا
شیخ کے موبہہ میں کوئی ناگ پھنی رہتی ہے

لاکھ نکلا کریں ارماں بھی دلوں کے، پھر بھی
ایک حسرت ہے کہ اللہ غنی، رہتی ہے

کچھ نہیں کُھلتا سینے کے نہاں خانے میں
سانس رہتی ہے کہ نیزے کی انی رہتی ہے

☆☆☆

جناب احمد مبارک

جناب صادق باجوہ

تعلیم الاسلام کالج یو-ایس-اے لمنائی کا اجتماع—جلسہ سالانہ 2016 کے موقع پر
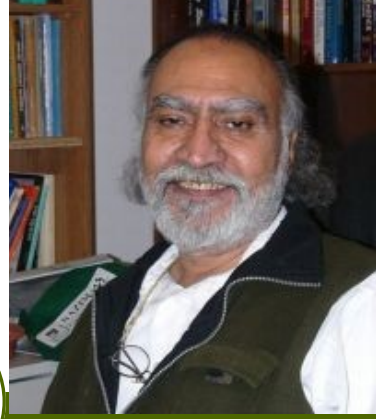
From T.I. College Rabwah to University of the Punjab Lahore

MUHAMMAD ZAFRULLAH

My arrival at the University of the Punjab Lahore was anything but routine, in personal terms it was a catastrophic event. I had topped the list for two consecutive years in B.Sc. Honors, and thought I was doing fine when it was announced that my result would be declared later on. I traveled to Lahore to enquire and found out that in my abstract algebra paper I had not secured enough marks to even pass. Boy and I was hoping to do a doctorate in it, which I eventually did.

I felt like a fellow in a posh attire sprayed on with sewage water, while pompously minding his own business; or like the US on 9/11, all so humiliated and let down. I kept repeating "Only the definitions and statements of theorems would get me the pass marks". "But" I was told that "The internal and external examiners agreed on the marks and so the review could not be ordered."

There was a general feeling at my college (Talim ul Islam College Rabwah) that the University folks did not want someone from T.I. College to pass in honors because then they would have to give the college a better status, allowing it to start M.Sc. Program. The religious prejudice against my community, the Ahmadiyya Community in Islam, was also mentioned as a possibility.

Some of my professors thought that I should accept my failure and move on and at least one thought I wasn't good enough to pass anyway (and he wasn't my Math Professor), while at least one of them thought I failed because I probably stuffed in some of my own "philosophy". (I had been reading Russell!) Qazi Muhammad Aslam the President of the college did say that if I wanted, the college would fight my case, but I should remember that if I escape then whoever "they" catch" in future will surely have had it. That some other Ahmadi should suffer on my account was not acceptable to me.

But the result was still "to be declared later on". And as I made another trip to Lahore I had the good fortune of meeting Dr. Syed Manzoor Hussain, Professor and the then Head of Department of Mathematics, a very shrewd gentleman. He obviously knew about my case, but patiently heard my complaint. Then he made some comments.

One of his comments amounted to saying that if my college could not handle teaching a third year honors student they should have transferred me to the university. Sort of made sense but at that time I felt honor-bound to say that my college was fine, as it was only one paper that I appeared to have a problem in.

I am glad that I did not fight what he said next. May God bless his soul; he was being very patient with me and very helpful. He told me that "they" (the registrar's office) "are wasting your time." He thought even if they decided to let me pass the procedure would be long, one year would be wasted and my degree would not be worth much.

The best course in his opinion was that I should

apply for the conversion of my honors degree into a B.Sc. pass course degree and get an admission to M.Sc. in the first year, for which I was already late. I came back to Rabwah consulted the Head of my community, His Holiness Mirza Nasir Ahmad, a former President of T.I. College, Rabwah.

His Holiness also thought Dr. Manzoor Hussain's advice was sound. When I expressed concern that accepting a pass course degree was the same as accepting failure and there was no financial support for failure, he reminded me that he'd already vowed to take care of my higher education. I came to Lahore and applied for the pass course degree on the basis of my first two years' performance.

While in Lahore I visited Dr. Manzoor Hussain again, told him I had taken his advice and expressed my financial worries. He told me not to worry about that and that he would arrange for a departmental talent scholarship. (These scholarships were for good prospects who missed the government scholarship for some reason.).

I also visited Government College Lahore, another institution offering M.Sc. courses, and met Dr. Lal Muhammad Chawla, the Head of Mathematics Department there. Professor Chawla expressed regrets at what had happened to me and promised financial assistance, if I decided to join the college. But I liked Professor Manzoor Hussain more; besides I was done with colleges. So when I got the pass course degree, I joined the P.U. Department of Mathematics.

By the time I did join I was late by two months. Of course I was familiar with some of the stuff being taught, but there were some courses that were different. I won't go into the details of how I managed, and will jump right into how I turned out to be a storm that the Department had paid for.

My first victim was Dr. Abdul Majeed. (He got his doctorate later.) For some reason he wanted to keep a record of those students who got the departmental scholarship. I think there were three or four of us, but there could be more. Two of them had missed using their government scholarships by coming to school a year later. I don't remember the cases of the rest, if there were others.

When he looked at me, I gave my name. Asked for the "reason" I shot back, "For being first-class-first-fail in B.Sc. Honors!" (The fellow who stood first in B.Sc. Honors, was so far behind in the first two years that with failure in one course my grades were better than his.) Boy that was a moment! Time seemed to freeze. He was taken aback a little but apparently remembered my case. Expressed regrets and made a show of attending to the next and then teaching.

Apparently, my stars were shining bright that day. It seems that Mr. Majeed decided to give me extra attention. He was a group theorist teaching a course on groups. Playing with " If A and B are subgroups of a group G then AB is a subgroup if and only if BA is contained in AB" I looked at the possibility of ABA being a group and noticed that if a-1 ba=b-1 ab then stating the order of a would suffice to define a finite group gp{a,b: a-1 ba=b-1 ab, a2 =1}. This developed further into some more general stuff, which got him interested enough to get me to write on it.

What I had written was some ten to 15 pages of decent English but gibberish as a Mathematical presentation, which Mr. Majeed helped me write into

http://www.lohar.com/…/A%20note%20on%20two%20generator%20fi…

He was instrumental in convincing me that becoming a pure Mathematician was as important as becoming an applied Mathematician. He actually goaded into thinking about becoming a pure Mathematician by saying "Just because Salam has become successful in applied you Ahmadis have joined the rat race of applied." God bless his soul, he knew how to rouse the rebel in me and how to calm the beast in me.

My next victim was Dr. Chawla. He came to our department to give a talk on the two functions he'd recently introduced. Now those two arithmetical functions are known as Chawla's functions. I heard his talk and immediately came up with a couple of extensions, in the time-honored tradition of be wise generalize. I decided that extensions of Chawla's functions would be the topic of my M.Sc. thesis.

My research supervisor, Dr. Mumtaz Kazi (He too got his doctorate later) was my third victim. I showed him what I had done and he suggested that I should take it to Dr. Chawla. Of course Dr. Chawla was overjoyed to see the results and mentioned my work at a couple of talks mentioning me as "that boy Zafrullah". I thought that was high praise. Between these two I completed my research that I had opted for in lieu of a paper.

Professor Manzoor Hussain taught us analysis in the first year and sets and logic in the second year. Once he said that there was no known formula for the number of partitions of a set. The next day I went along with a simple recurrence relation. That day our class had to suffer through "my lecture". I did write an article on this too. (Of course the recurrence relation that I set up was known.)

I have gone through all this detail to show that my teachers at the University of the Punjab were not the enemies that I thought they were. They taught and trained me and took deep interest in me as their own. Because of my Honors mishap I had developed high blood pressure and somewhat quarrelsome persona. They moved in to defuse the situation whenever things were in danger of getting out of hand due to my quick temper.

They were the true teachers and true guardians of my interests. I remember that towards the end the final exams were getting close and I talked about my research whenever I met Dr. Kazi. One day he says, "Bring along all your work, I want to see if something more needs to be done." When I brought the file, he took it, put it in a drawer, locked it and told me, "Now, go and prepare for your final exams. I will give these to you after the last paper. There'd be plenty of time to write it up."

Come the result time my result was, again, "to be declared later on". I went to the department, all so worried, to find out that my topology paper had gone missing. But as I had good all-round result, they were sure to assume that I had secured at least a first class in it. I didn't make much fuss, as with that grade I had fifth or sixed position in the university. What will better grade do? Improve my position one notch or two notches, and that did not seem important at that stage.

Chawla's functions and related questions held my interest a while longer and my liaison with Dr. Chawla stayed strong. While I was teaching at T.I. College, Professor Chawla was appointed as the Chairman of Sargodha Board of Education. My visits to Sargodha became more frequent those days. At one of those visits he told me that he was offered a Professorship at the Kansas State University and that he could give two research assistantships to students of his choice and asked me if I was interested.

Of course I would not take any decision without the consent of the Head of my community, who had been taking interest in my education since I came to T.I. College as a student. So, I told Dr. Chawla that if His Holiness Mirza Nasir Ahmad permitted I would be ready. I thought I'd ask when I was granted the next audience. When I finally went to see Hazrat Mirza Nasir Ahmad, His Holiness mentioned that Professor Chawla had visited him and asked that I be sent with him to the US and that His Holiness had other plans for me. My liaison with the Professor slackened a little, but only for a while.

I went to Britain for my doctorate while Professor Chawla was away in the US. We kept in touch until the Professor's death. May he rest in peace, when I first met him he seemed to be my enemy, as he was the external examiner, and when I heard of his death I felt as if a father-figure had departed. I have published at least two papers on arithmetical functions related to Chawla's functions.

(1)On the evaluation of a certain arithmetical function, J. Natur. Sci. and Math. 12(1972), 363-365 (with S.M. Kerawala)

(2)On generalized multiplicative functions I, J. Natur. Sci. and Math. 28(1988), 257-268.

Things weren't all so rosy all the time. One of my professors did not like me and I didn't like him, but nothing too drastic resulted from that. Partly because of him, I decided not to apply when Dr. Manzoor Hussain suggested that I should apply for a research assistantship at the department. (This was a coveted position, next only to being appointed as a lecturer at the department. It meant departmental

support for a foreign stipend.) The internal examiner of that unlucky paper had also come out clean saying that she had dittoed on the grade assigned and that she was sorry for what she had done.

The burning questions then remain: Who killed my paper? Lal Muhammad Chawla who could have easily have pushed aside my research as worthless but didn't, would not do an unfair thing to a student. If he had done from hate the same thing, why would he travel all the way from Sargodha to Rabwah to ask for me the abominable little fellow he loathed so much? This doesn't quite calculate. So did I actually fail? To that I'd repeat that only definitions and statements of theorems could have gotten me pass marks by Pakistani standards.

Now before I leave that question essentially unanswered by saying that, of course I could have made some bad mistakes and not secured enough marks, let me mention an odd event that I have kept to myself all these years. When that unfortunate paper was about to begin an invigilator came to my desk and told me to check if I had something that could be construed as an aid to copying. He conspiratorially told me that "they" were up to no good and would try to hurt me.

I had nothing incriminating on me, have no idea why keep the stuff on your person after writing it down for copying. I'd remember what I had written anyway. But I made a show of checking, told him I was clean and thanked him. Inwardly, I thought he must be some over protective Ahmadi fellow.

If you like you can mull over this event and ask: What did transpire that day? Could it be that the paper was so mutilated that assigning a passing grade would be a shame? If Zafrullah's failure in that paper was so patent, what kept the university from announcing the result?

You may call it a later fabrication and an effort at undoing something which was done long ago in pursuance of rules. But as God is my witness, it did happen. Oh and there are a number of things that I said for which it may not be easy to gather evidence. For those I take refuge in "I be cursed if I have lied" and in at this stage getting a B.Sc. Honors won't get me any extra brownie points.

Whether I actually did perform poorly in that paper or not is immaterial now, but an extra year at the university did me a world of good. While my teachers at TI College were all competent, they were only three and of those Professor Ibrahim Nasir had been ill for some years and at times when he was too ill to come to the college, I had to go meet him.

So, I was prepared for my final year by two overworked gentlemen and this must have left some weakness. Couple it with the fact that when the Math Department at TIC was in a better shape a somewhat better candidate was unsuccessful in passing the B.Sc. Honors. In any case thanks to my "failure" I had good training at the hands of several very competent and highly educated people who taught and trained me as their very own with some recently acquired psychological issues. As I look back, I admit with gratitude that they did admirably well. By my reckoning it was thanks to that training that I was able to write a decent enough doctoral dissertation within two years of my arrival in UK.

While I leave you with these thoughts I plan to struggle with: Considering the recent clobbering:

http://www.lohar.com/blog/?p=443

I am getting from my "friends" was it these friends that set me up for failure and are now angry that I survived?

Taking Down Terrorists in Court

William Finnegan
The New Yorker, May 08, 2017

Zainab Ahmad has prosecuted thirteen international terrorist suspects for the American government. She hasn't lost yet.

(William Finnegan, The New Yorker, May 08, 2017)

Zainab Ahmad had a small disaster in Saudi Arabia. "I always borrowed an abaya from the legat in Riyadh," she said. An abaya is the full-length robe that is required dress for women and girls in Saudi Arabia. "Legat" is short for the legal-attaché office, the F.B.I. presence in an American Embassy. Ahmad is an Assistant United States Attorney with the Eastern District of New York. "A button came undone during a meeting, and suddenly it was like something out of 'Showgirls.' " Ahmad laughed. The Saudis were unamused. "After that, I went and bought my own abaya on Atlantic Ave."

Ahmad has probably spent more hours with Al Qaeda members and other terrorists than any other American prosecutor.
Photograph by Pari Dukovic for The New Yorker

We were sitting in a diner on Cadman Plaza, across from the Brooklyn federal courthouse. Ahmad, who is thirty-seven, was looking litigation-ready, in a well-cut dark suit and a cream blouse. "That's Judge Glasser," she whispered, motioning with her eyes toward another table. "He did the Gotti trial."

The Eastern District of New York has long been known for its work against organized crime. Since the September 11th attacks, E.D.N.Y. has also become an aggressive prosecutor of terrorism, securing more convictions than any other U.S. Attorney's office. Ahmad's specialty is counterterrorism, her subspecialty "extraterritorial" cases, which means that she spends a great deal of time overseas, negotiating with foreign officials, interviewing witnesses, often in prison, and combing the ground for evidence in terror-related crimes against Americans. She spends time in American prisons as well, typically with convicted jihadists. A former supervisor of Ahmad's told me that she has probably logged more hours talking to "legitimate Al Qaeda members, hardened terrorist killers," than any other prosecutor in America.

"They're treasure troves of information about the networks, once they decide to coöperate," Ahmad told me. "Some of them didn't expect to be here, to face any consequences. Their plan was suicide. Now they're very vulnerable. Everybody's human. You pull the levers." The main lever that prosecutors have with coöperators is a reduced sentence. For naïve

young men, disenchanted with jihad and looking at forty years to life, that can be a powerful incentive to talk. Ahmad may ask them to testify in court. She has prosecuted thirteen people for terrorism since 2009, and has not lost a case.

That week, in the courthouse across the street, she had finished a hearing in the case of a Malian man accused of murdering an American diplomat in Niger. In December, 2000, William Bultemeier, a military attaché, was gunned down in a midnight carjacking outside a restaurant in the capital. The accused was Alhassane Ould Mohamed, also known as Cheibani, who was famed around the Sahel as a smuggler. He was arrested, and the case seemed strong. Bultemeier's vehicle, a Toyota Land Cruiser that belonged to the Embassy, was recovered in Timbuktu, and Cheibani's fingerprints and DNA were found inside. A security guard at an Air Afrique office testified to seeing him commit the shooting.

In 2002, though, Cheibani escaped from jail, and reportedly went to work for Al Qaeda in the Islamic Maghreb. A.Q.I.M. finances its campaigns by smuggling and by kidnapping Westerners, and Cheibani was said to have participated in the kidnapping of two Canadian diplomats in 2008. After a subsequent attack on a Saudi convoy in Niger left four dead, he was caught, tried, and sentenced to twenty years. Then he escaped again, in a mass breakout mounted by Boko Haram.

In 2012, Ahmad got the Bultemeier investigation, by then a very cold case, reassigned to E.D.N.Y. The next year, with Cheibani "in the wind," as Ahmad put it, she obtained an indictment, and soon afterward the French Army caught him in an Al Qaeda column in northern Mali.

In Brooklyn, Cheibani's lawyers, public federal defenders, had requested a suppression hearing, hoping to quash some of the prosecution's evidence on constitutional grounds. Such hearings are a chance for the defense to get a preview of the government's case. The preview that Cheibani and his lawyers got was discouraging. "They know Zainab's reputation," a federal prosecutor who has worked with Ahmad said. "They know their chances are not good."

Ahmad had made numerous trips to West Africa, chasing leads, collecting evidence, interviewing potential witnesses. For the hearing, she brought in seventeen witnesses from Niger and Mali, few of whom were prepared for a New York winter. "Half of them had only sandals," Ahmad said. "We were all frantically scraping up coats, hats, shoes. We came this close to putting a woman on the stand in a yellow hat with a pompom." At the hearing, in the marble and mahogany grandeur of a Brooklyn federal courtroom, Cheibani was presumably astonished to see seventeen Africans ready to testify against him. On March 24, 2016, he pleaded guilty to conspiracy to commit murder, and was subsequently given a sentence of twenty-five years. "He's not an ideological jihadist," Ahmad said. "He's in it for the money. But a lot of people are in it for the money, and his knowledge of the Sahel has been very valuable to A.Q.I.M."

Knowledge is everything in counterterrorism. "Cooperators are the unsung heroes of this business," Ahmad said. One of her former supervisors at E.D.N.Y., David Bitkower, told me, "You cooperate some kid from Minneapolis in 2009, and a couple of years later he's going to help you prosecute an Al Shabaab commander, who is going to help you pursue defendants farther up the chain." Ahmad considers all her time with ex-jihadists well spent. "They always know more than they think they know," she told me. "Everything they remember helps fill in the picture."

Trials are relatively easy, in Ahmad's view: "There's a neutral arbiter—a judge, a jury. You make your best argument, and they decide." Getting an extraterritorial terrorism case charged, on the other hand, requires establishing facts to the satisfaction of an American grand jury about events that occurred, often years ago, in faraway places. For Ahmad's cases, those places have included Afghanistan, Pakistan, Yemen, Iraq, Saudi Arabia, Tunisia, Algeria, Syria, Nigeria, Niger, Kenya, Somalia, Trinidad, Guyana, Canada, and the United Kingdom.

But the hardest part of bringing a terrorism suspect onto American soil, she says, has usually been convincing the U.S. government that it's safe. Special approval must be obtained both from Main Justice—as government lawyers call Justice Department headquarters, in Washington, D.C.—and from the Na-

tional Security Council, in the White House. The political opposition to such transfers has been entrenched for years on Capitol Hill, and has only intensified since the attempt to put Khalid Sheikh Mohammed, the alleged mastermind of the 9/11 attacks, on trial in Manhattan federal court. That effort failed, in 2010, in the face of objections from Congress and local officials.

In the Senate, the drive to oppose and defund civilian trials for accused terrorists has long been led by the Republicans Lindsey Graham of South Carolina, Chuck Grassley of Iowa, and Jeff Sessions of Alabama. "This is no way to fight a war," the three senators and a group of their colleagues wrote, in a 2015 letter to Eric Holder, then the Attorney General. The letter referred, specifically, to several extraditions that Ahmad was involved in. The senators and their allies strongly prefer that foreign terrorists who target Americans be detained in the military prison at Guantánamo Bay and, when possible, tried by a military tribunal. In 2009, Sessions, who is now the Attorney General, added an amendment to a military spending bill titled "No Miranda Warnings for Al Qaeda Terrorists."

Ahmad and her colleagues have been working meanwhile to develop, with considerable quiet success, a criminal-justice alternative to Guantánamo. It's a high-wire act. The public has unique expectations of law enforcement with respect to terrorism. "When there's a bank robbery, we try to solve the crime," Ahmad said. "But nobody thinks our job is to stamp out bank robbery. Terrorism is different. People expect us to prevent it." Many terror cases are difficult to make, with the strongest evidence often classified or inadmissible. "And we can't afford to lose," Ahmad told me. "We can't get anything wrong. If we lost a major extraterritorial case, there might never be another chance."

Ahmad had a multifaceted upbringing. She grew up in suburban Nassau County, Long Island, with her father and stepmother and two younger brothers, and she also lived part time with her mother, in Manhattan. Her parents had divorced, amicably, when she was an infant, and, as Zainab grew, according to her father, Naeem, "she would play Mom off against Dad, but always for one thing—to buy more books." Her parents were part of the Pakistani diaspora, and Zainab spent summers in Pakistan and England. Visits to Pakistan were an adventure—she had dashing, rowdy cousins—but England was often a shock. "You could feel the discrimination," she told me. "My cousins, no matter how successful or well educated, were never going to be accepted as British. People would ask me where I was from. I'd say I was American. Then they'd say, 'Yes, but where are you really from?' I was always so glad to get home."

"We felt comfortable here," Naeem told me, when I visited him and his wife, Nasrin, at their home, in East Meadow. "I felt comfortable with my neighbors, and never told my children to avoid kids because they're Christian, Jewish—none of that." (Most of Zainab's friends as a child were Jewish.) Naeem, a retired engineer, is an active member of a local mosque, and has taught Sunday school since the nineteen-eighties. "I am a very religious man," he said. "But not a religiosity man. I don't care what other people do."

Naeem and his first wife, Jamile, left Pakistan for Canada in the nineteen-seventies—for economic reasons, he said. But his engineering degree, from the University of Peshawar, was not recognized in Canada, so he found work investigating insurance claims. In 1977, the couple moved to New York, where Zainab was born three years later. Naeem managed a restaurant in midtown and later helped run a construction firm. His boss, who eventually became his partner, was a Hindu from India. "We're both from the Punjab," Naeem said. "But if there was a war between India and Pakistan we didn't bring it home. We were the same, except he went to temple and I went to mosque."

Zainab's parents describe her as a cheerful, precocious child. "She never walked, she always skipped," Jamile, who now lives in Pakistan, told me. "Her sixth-grade teacher praised her respectfulness, and that meant a lot to me. A lot. It's difficult to raise a respectful child in the U.S." When Zainab was eight or nine, she and Naeem read the entire Quran together, which took about a year. She didn't understand a word, she said. Later, as an undergraduate at

Cornell, majoring in health policy, she studied Arabic. "We talked every night," Naeem said. "She would give me the gist of the Arabic. I would send her back to class with new ideas and questions." Even as a lawyer, he said, "she sometimes uses me as a bounce-off for ideas—to see what I say."

Naeem served lunch and tea. A few days earlier—this was last spring—there had been a Trump campaign rally in Bethpage, a couple of miles to the east. "You could hear the roaring from here," Naeem said. "Everything but the '_Build the wall! _'s." Like his daughter, Naeem has a quick tongue and a ready laugh.

Nasrin, a tall, smiling woman in her fifties, is the town clerk of Hempstead, which has a population of eight hundred thousand. She is the first elected official of South Asian extraction in New York State. While we talked, white guys in pickups parked in the driveway and came to the front door, where they conferred with Nasrin over sheaves of documents—constituent service on a rainy Saturday afternoon. The American Dream lives on Long Island.

And yet I remembered Zainab saying, "If I were fifteen now, growing up where I did—I don't know. Everything's changed." She meant the level of mistrust that Muslims in America face. "When I was a kid, even though I had a funny name, and didn't look like everyone else, it honestly took me a very long time to realize that. There was nothing that made me feel different. Substitute teachers would come, and start to take attendance, and hesitate, because my name was at the top of the class list, Ahmad. They'd say, 'I know I'm going to pronounce this wrong.' And the whole class would be, like, 'Zainab. Duh.'

"Every year, in elementary school, we'd have American Heritage Day. Everybody would say where their family was from. Germany. Poland. I remember, in second grade, saying, 'My family's from Pakistan.' The teacher pulled down a map, and I didn't know where Pakistan was, even though I'd been there. I was totally embarrassed. But then I was relieved because the teacher didn't know, either." Ahmad laughed. "I'd kind of like to go back to a time in America when teachers didn't know where Pakistan is."

Jamile told me, "When Zainab was little, she wanted to be a receptionist. She loved answering the phone. Then she wanted to be a nurse. I mentioned lawyer, because my dad was a lawyer, but I wasn't serious." Ahmad herself is vague about how law happened. She had planned to be a hospital administrator, but things went sideways after the September 11th attacks, and she ended up at Columbia Law School, on a full scholarship. One judge she clerked for, Reena Raggi, of the Second Circuit Court of Appeals, recalls her strong academic background in finance and economics. "She excelled in a variety of areas," Raggi told me. "Her ability to analogize. Her aptitude for solving problems. She has a deep critical mind. Zainab doesn't come across as a hardboiled, aggressive prosecutor. She's reserved—that's her upbringing. She would have been successful in any field. But, I must admit, I didn't see this coming."

Naeem once got a call from his daughter while she was clerking for U.S. District Judge Jack B. Weinstein. It was 2006, at the end of a major Mafia trial. "Zainab was crying," he said. "The defendant had been convicted. She said, 'I couldn't take it when he took off his watch and his necklace and gave them to his family.' She had got to know these people. So I said, 'Which side would you rather be on, the government or the defense? You're not after the person, you're after the truth.' "

When Ahmad joined the Eastern District, in 2008, she first worked on Brooklyn and Staten Island gang cases, but soon found herself drafted into a terrorism investigation that centered on a plot to blow up fuel tanks and pipelines at John F. Kennedy International Airport. The plotters, one of them a former baggage handler, were a motley quartet from Guyana and Trinidad, and the case led to both Iran and Al Qaeda. "You start following a disgruntled baggage handler, a guy who's mouthing off in Queens," Ahmad said. "But he has the potential to connect with serious networks—and this guy did it." Russell Defreitas, the baggage handler, made trips to Guyana, looking to contact a senior Al Qaeda leader. When his search failed, he settled instead for Abdul Kadir, a chemical engineer and former member of Guyana's parliament, who had transferred his allegiance to Islamist extremists in Iran. The investiga-

tors moved carefully, placing an informant with Defreitas, but not, at first, asking him to gather evidence with a tape recorder. "We weren't sure about Guyana law, or the Guyanese, and you don't want to blow your informant," Ahmad said. "We're not the intelligence community. We're law enforcement. We have to declare we're there. You have to figure out who you can trust. Eventually, we worked it out, and we got him recorded."

Marshall Miller, the lead prosecutor on the case, was struck by how Ahmad took to the work. "Zainab was really good in Guyana with local law enforcement," he told me. "She made them feel respected. Ninety per cent of prosecutors, that doesn't come naturally to them. They want to get shit done. But the best prosecutors are born diplomats, particularly in this field. You need to be able to relate to people from all over the world."

Miller's team discovered links between Kadir and Mohsen Rabbani, an Iranian diplomat believed to be the mastermind of the 1994 bombing of a Jewish community center in Buenos Aires. Kadir, they determined, was planning to engage the Iranian military and special forces in his plot. When he tried to fly to Iran, they abruptly halted the investigation and had the plotters arrested. "We had to take it down," Ahmad said. "If this were all happening in the U.S., you could afford to let it go and roll up more people. They didn't have explosives yet. But if he goes to Iran he goes totally dark. He already had the J.F.K. plans. We couldn't let him get away."

At the trial of Kadir and Defreitas, in 2010, Miller assigned Ahmad to make the closing argument. She knew the case thoroughly, and had shown poise and fluency in court. In the summation, she gave a bracing description of the plotters' intent: "Their goal was to destroy the economy of the United States. They knew that accomplishing that goal would take lives, and they didn't care. In their view, the innocent lives lost would be mere collateral damage."

Defreitas had testified that his tape-recorded plans to cause devastation were just empty talk. "Ladies and gentlemen, that is ridiculous," Ahmad said. "It's not like you find your kid brother borrowed your car and crashed it and you yell, 'I'm going to kill you!' Everybody realizes you are not actually going to kill your brother. You're just blowing off steam in the heat of the moment. That is not what we're dealing with here. . . . Russell Defreitas is doing everything he can to make his nightmare a reality." The jury deliberated for five days. Then they convicted Defreitas and Kadir on multiple counts of conspiracy to commit acts of terrorism. Both men were sentenced to life in prison.

There are ninety-three U.S. Attorney's offices. Of these, fewer than half a dozen are in a position to pursue extraterritorial cases. Terrorism is only one area of transnational crime, but it is easily the most high-profile. In recent years, E.D.N.Y. has in some ways overtaken its traditional rival, the Southern District, which is based in Manhattan. "Competition with S.D.N.Y. makes you kind of entrepreneurial," Marshall Miller told me. "We're like the scrappy little brother. Immediately after 9/11, we had, I think, zero terrorism cases. The goal was to change the program. You gotta go out there and make friends with all the agents and legats. S.D.N.Y. was haughty. They let you know they're the best. We tried to be the guy you wanted to go out for a drink with. Friendly." Experienced agents noted the hustle. Tara Bloesch, an F.B.I. special agent, who has completed several tours in Pakistan and is now based in Philadelphia, told me, "If there's a way to legally establish venue, the E.D.N.Y. will do it. Maybe it's just the airport that returning fighters land in—anything."

When the F.B.I. has a promising investigation, it becomes like a client shopping for a lawyer. Which U.S. Attorney's office would be most effective on this case? As Ahmad began travelling in the Middle East, Africa, and Europe, and began winning significant convictions, her stock at the F.B.I. rose. Judge Margo Brodie, of the Eastern District, who was formerly the deputy chief of the Criminal Division at E.D.N.Y., told me, "Agents were bringing their cases to the office, begging to have her take them. It never dawned on her that the reason she had so much work was that she's so good."

Bloesch worked closely with Ahmad on a gruelling 2015 trial, providing information about events in Pakistan. "I've never seen anybody work that many hours," she said. "Everybody else kind of falls

in line. We worked Saturdays, Sundays." Celia Cohen, one of Ahmad's co-counsels on that case, lives in New Jersey and has two young children, but she moved into Ahmad's apartment in Manhattan for three weeks during the trial. "We hardly slept," Cohen told me. "It was like college. We just discussed the case till we crashed and woke up with new ideas."

Building an extraterritorial terrorism case typically requires permission from foreign governments to conduct investigations in their domains, and then assistance in apprehending suspects and transferring them to American custody. This process can involve a great many sign-offs—delicate, overlapping negotiations prone to being buffeted by political and bureaucratic winds.

When Ahmad revived the case of William Bultemeier's murder, in West Africa, David Bitkower, her supervisor, had doubts. "That region is not a five-star destination at the best of times, and this was not the best of times," he said. "Al Qaeda had just taken over the northern part of Mali. Zainab was bound and determined, though. It was a righteous case." In Niger, she interviewed police officers who had dealt with Cheibani, and the owner of a garage where he had left his truck on the night of the murder. She found another eyewitness, a one-legged beggar called Toto, who was still working outside La Cloche, the restaurant where Bultemeier had eaten his last meal. The original eyewitness, the security guard, had long vanished and was presumed dead. Ahmad found him, too. "He was petrified," she said, but ultimately agreed to testify. For that, Ahmad gave credit to her case agent, John Ross, a former New York City police officer: "Ross has incredible people skills."

Ahmad and Ross went next to Algeria, looking for a woman who had been engaged to a Cheibani associate. Her house in Niger had been searched in the initial investigation. "Maybe we can put Cheibani in Niger," Ahmad said. "That would be huge. Because we've only put him in the truck." The woman and her daughter were a prostitute team, now living in the southern Algerian city of Adrar. "We got a lot of pushback from the Embassy on that trip," Ahmad said. "I felt strongly that we should go, and not ask for the witnesses to come to Algiers. We're the supplicants here." The daughter turned out to be helpful, and Ahmad put her on the list of witnesses to be flown to Brooklyn. "But the interview process was so cumbersome there, so formal. We had to take an Algerian judge with us to her house. The defense attorneys don't have to do that."

But, in the view of Joshua Dratel, a New York attorney who has represented a number of high-profile terrorism defendants, it's the government that actually enjoys an advantage in evidence-gathering. "Foreign governments won't coöperate with us," he said. "Foreign witnesses even won't coöperate with us. They're afraid that we're really U.S. agents, or that they'll get in trouble if they talk to us."

Ahmad, who really is a U.S. agent, says that she also struggles to cultivate foreign witnesses. "We can't just go knock on doors in Niger. Defense attorneys can. I need permission from the Embassy, the State Department, the Niger government. We're a government engaged in sovereign relations with a foreign government, and in deference to them."

Ahmad pursued the Cheibani case because, she said, it seemed both important and feasible. "It's all triage," she said. "It's not like we're going around West Africa trying to charge everybody who supports A.Q.I.M. or Boko Haram. This was the murder of an American diplomat. I remember an official in Niger saying, 'I really hope my country will do what you're doing if something happens to me.' "

Cheibani's home town of Gao was out of reach; it lay in the part of northern Mali that was being held by Al Qaeda and its affiliates. "The A.Q.I.M. flag was flying over Gao," Ahmad said. But the Gao policemen who had originally arrested Cheibani had fled south, and she found them outside the capital, Bamako. They told her that Cheibani had spoken freely about his crime, and that they had found parts of Bultemeier's vehicle—a bumper, a luggage rack—in a search of his house. She felt ready to charge.

Ahmad arranged for the policemen to come to Brooklyn and appear before a federal grand jury, and in June, 2013, the jury returned a sealed indictment. A few months later, when the French Army reported capturing Cheibani, Ahmad was uncertain that it was really him. The Sahara is a big place. But, she said, "We had his biometrics, from his Bamako arrest. Turned out it was him." The French handed Cheiba-

ni to the Malians. As Ahmad worked toward an extradition, her diplomatic skills were at full stretch. Cheibani's criminal networks were formidable, and any of the governments involved—France, Mali, and Niger—could have halted the process at any time. Finally, she told me, the Malians said, "Yes, come and get him." Ahmad exhaled, shaking her head. F.B.I. agents retrieved Cheibani. "They Mirandized him on the plane," she said. "I first saw him at his arraignment. He looked much older than his photos, like he'd led a hard life. It was one of the most moving moments I've felt doing this work."

Ihad heard from several people that Ahmad has a great rapport with juries. When I asked her about it, she seemed embarrassed. We were back at the Cadman Plaza diner—which, I'd learned, Brooklyn prosecutors call the Perp Diner. "I don't know," she said. "Maybe it's because I feel comfortable with them. The mosque I went to as a kid was in Queens, and it drew people from all over Brooklyn, Long Island, the Bronx—cabdrivers, truck drivers, regular working-class people. My parents' friends came from their mosque. When I look at these Brooklyn juries, I see the people I grew up around."

Ahmad lives downtown, in an apartment that looks out on East Fourteenth Street. Her mother, Jamile, visits every summer. She's an elegant woman, who had worked as a computer programmer at an insurance company in midtown for many years. She loves New York, and steps lightly through the swelter of an East Village sidewalk. "In Pakistan, we grow up street-smart," she said. "In America, the children are so naïve. Zainab is naïve. Zainab would be shocked if I ever told a lie. 'What?' In Pakistan, kids would never be fazed. But I think that's important—to irk your child. So I'm here."

Ahmad was briefly married, to a lawyer from Jordan, but is now divorced. Though she lives alone, and travels constantly, she manages a busy, even glittering social life. "Zainab has a wider range of people she's close to than the rest of us do," a friend of hers, a freelance writer, told me. "She'll throw a party at her place, and it's cops, actors, journalists, filmmakers, doctors, businesspeople, Pakistani lawyers, academics. She doesn't cook, but there's always a ton of food. She's the sort of person everybody wants to make food for. I first met her at a rooftop barbecue in the Village. It was dark, but it was like she was sunny—I can't think of a better word for it. You see that light, and you want to get near it."

After hours, Ahmad likes to sing karaoke at a joint on Avenue A. "She always sings lighthearted, feisty-girl songs," her friend said. "I thought Taylor Swift was just trendy and beneath notice until I heard Zainab sing 'Blank Space' there with her cop friend Ed." On cross-examination, Ahmad admitted that her signature karaoke tune is "Manic Monday," as interpreted by the Bangles. Her youngest brother likes country music, so they belt out Luke Bryan's "That's My Kind of Night" on drives out to see the folks on Long Island. On road trips with her best friend from college, Shally Madan, who lives in California, Madonna, Rihanna, and the "Bend It Like Beckham" soundtrack see heavy rotation.

Ahmad seems barely to share her intensity (or much else) about her work with her non work friends. "She's so offhand about it," the freelance writer said. "She doesn't let her work hang over her like a pall. Last year, she had just finished some very tricky case. Then we went out and sang karaoke."

There is, of course, much about her work that Ahmad can't discuss with anyone lacking the relevant security clearance. When I asked her, at the Perp Diner, about how an American prosecutor "cooperates" a jihadist, she drummed her fingers, shook her head, and finally came up empty. "Everybody I've flipped is still under seal."

On certain mornings, when she's in town, her workday starts with a walk across town to Chelsea, where the New York Joint Terrorism Task Force has its headquarters. One floor of the building is a Sensitive Compartmented Information Facility, a secure area that blocks surveillance. Ahmad leaves her phone outside. Inside, she can speak freely about cases by teleconference with intelligence operatives, diplomats, and military officers with top-secret clearance all over the world.

In combatting terrorism, Ahmad says, there is no conflict between the military and the civilian criminal-justice system. She works closely with the Pentagon, and defers to the military where it has jurisdiction. In one case, she was pursuing an Iraqi-

Canadian charged in the murder of five American soldiers, killed by suicide bombers whom he had helped travel from Tunisia to join Al Qaeda in Iraq. The man was living in Edmonton, and Canada, like most countries, will not consider an extradition request from the U.S. military as long as Guantánamo remains open. To persuade the Canadians, she had to gather evidence in Iraq, which was then unstable enough that Ahmad and an F.B.I. colleague had to take cover from daily rocket attacks. As Ahmad investigated, she was transported in military helicopters. In Mosul, she stayed on a U.S. military base, and soldiers brought witnesses to the perimeter for interviews. "I think military investigators often see us as finishers," she told me. "They may have a lot of evidence on somebody. We've got the machinery, and the credibility, to charge and try that person." After four years, she persuaded Canada to extradite the man.

Some of the indictments that Ahmad has obtained remain sealed, usually because the suspect is still at large, and I suspect—Ahmad says she disagrees—that this can produce conflicts of interest, if, say, the Pentagon and the C.I.A. are trying to kill the same individuals she is trying to haul into court. This seems to have been the case with Mohanad Mahmoud al-Farekh, a Texan who became a high-ranking Al Qaeda leader. The Justice Department wanted to prosecute him, but the Pentagon and the C.I.A. reportedly wanted to put him on a kill list, arguing that he could not be captured. As it turned out, Farekh was captured by Pakistani forces in 2014 and handed over to the U.S., where Ahmad charged him, under seal, the following year. He now awaits trial in Brooklyn.

For Ahmad, the more complex collaboration is with U.S. intelligence agencies. Spies and prosecutors investigating terrorists are often after the same information, but spooks cannot, for obvious reasons, be called as witnesses. "We discovered, as terrorism cases ramped up, that we needed to put in a second informant," Marshall Miller told me. "We had to have one who could testify in court." If Ahmad uses evidence gathered by intelligence agencies in a public trial, she risks revealing sources and classified data. Prosecutors are obliged to ask permission to use this evidence, and, as with extraditions, these are not negotiations that can be conducted by e-mail. "You have to go there, whether it's to Langley or Nigeria, and meet with people, explain what you want, gain their trust," she said.

Any exculpatory evidence must be disclosed to the defense, though attorneys need security clearances to see classified information. "They're usually disappointed," Ahmad said. "They want to know where the real Super Secret Squirrel stuff is. But there is no real Super Secret Squirrel stuff. We wish."

Joshua Dratel, the New York attorney, says that, in counterterrorism cases, the government's control of information gives it another advantage. "By making juries anonymous, we're telling jurors that the defendant is really dangerous," he said. "I've had the government put an anonymous expert on the stand. The standard of probable cause for surveillance is diluted in national-security cases. They don't even need a warrant for overseas wiretaps. In the past decade, we see much less classified information, and we have to get a lot of it through the judge, who knows nothing about the case."

"We were a bit desperate before Zainab showed up here," Mark Smith, the head of covert policing for the Greater Manchester Police, said. British intelligence had caught wind of an Al Qaeda operation in 2008. About a dozen men from Pakistan had entered the country on student visas, registered for classes, and immediately quit school. Surveillance showed them to be scouting a range of public venues, eventually concentrating on the Arndale Centre, a large shopping mall in Manchester that, in 1996, was the target of an I.R.A. truck bomb that devastated much of the city's retail district. Abid Naseer, a graduate student from Peshawar, with a B.A. in English literature, began to regularly e-mail an Al Qaeda handler in Pakistan. He wrote that he was planning to get married soon, but in his daily rounds there was no sign of a fiancée, or of marriage preparations. This was a code that the Brits had seen before. The wedding day would be the attack day.

"We devoted all of our counterterrorism resources to this surveillance," Smith, who was then

leading the region's terror-investigation force, told me. "We had twenty-five, twenty-six teams trying to watch nine guys. What if one of these guys goes off the radar? The risk was high. When we saw the attack-dates e-mail, we had to strike."

Law enforcement pounced too soon, though. From the intercepted e-mails, and from quantities of flour and oil found in Naseer's flat—Al Qaeda teaches operatives how to build bombs starting with flour and oil—the authorities inferred that the group had planned to make bombs with chemical detonators and an organic charge, similar to those used by the bombers who struck three Tube trains and a London bus in 2005, killing fifty-two. But no bomb-making chemicals were found, and the British press grew increasingly dubious. The government, hoping to make the whole thing go away (the exchange-student business in Britain is large and lucrative, Smith pointed out), decided to deport the suspects rather than prosecute. The detectives on the case were horrified when they heard the news, at the prosecutor's office. "I couldn't accept it," Smith told me. "They nearly called security to remove us."

Naseer fought his deportation, arguing that a return to Pakistan would be unacceptably dangerous, and he won the right to stay. But by then the Americans had become interested in his case, particularly after British intelligence alerted the F.B.I. that the e-mail account that Naseer had been reporting to—the Al Qaeda handler in Pakistan, e-mailing as sana_pakhtana@yahoo.com—had started receiving e-mails again, this time from a jihadist in the United States who was asking for bomb-making instructions. "I nearly crashed the car when I heard that," Smith told me. Ahmad said, "It was really bad op sec"—operational security—"on Al Qaeda's part, to use the same Yahoo address. I mean, come on." The U.S. plotters were arrested. Ahmad headed to Manchester.

"When Zainab walked in the room, we said, 'Crikey, she looks awfully young. Is this a junior sent here to fact-find?' " Smith said. "Within a few minutes, though, it was, like, 'Whoa, she knows what she's doing.' There was no comparison with U.K. prosecutors. Zainab stayed four days with us on that first visit, and left us a big list of evidence she wanted, and exactly how she wanted it packaged up."

Ahmad's goal was to demonstrate that Naseer's plot was part of an international conspiracy, allegedly organized by Al Qaeda in Pakistan, to bomb targets in the United Kingdom, Denmark, and the United States. The would-be U.S. bombers were three young men who had been classmates at Flushing High School, in Queens, and then, in 2008, travelled together to Pakistan to join the Taliban. They ended up instead with Al Qaeda, from whom they received military training and, ultimately, orders to return home and carry out suicide bombings. They were of more use to the cause, they were told, using their local knowledge to attack New York City than they were in Muslim lands. After considering Grand Central Terminal, Times Square, and other landmarks, they settled on bombing subway trains at rush hour. By now, the authorities were monitoring their phones, however, and reading their e-mails to Al Qaeda, which used much of the same code that Naseer had used, including an upcoming "wedding."

One of the U.S. plotters, Najibullah Zazi, an Afghan-American, was working as an airport-shuttle driver in Denver. Following instructions that he had e-mailed to himself from Pakistan, he bought hydrogen peroxide and acetone from local beauty-supply outlets, rented a hotel suite in nearby Aurora, and used the kitchen to cook up triacetone triperoxide, a detonator explosive similar to that used in the London attacks. He tested the mixture in the hotel parking lot. It exploded, as he had hoped. Zazi packed the detonator explosives in a rental car and drove to New York.

As he crossed the George Washington Bridge, police stopped him, at the request of the F.B.I., but they failed to find the jar of explosives in the car. Zazi was spooked. Then his rental car got towed in Queens, with his computer, containing all the bomb-making instructions and incriminating e-mails, inside. Zazi flushed the explosives down a toilet and flew back to Colorado, where he was arrested almost immediately. His accomplices were detained a few months later, and, in 2010, Zazi pleaded guilty to multiple terrorism violations; one accomplice, Zarein Ahmedzay, also pleaded guilty. Zazi and Ahmedzay are still awaiting sentencing, as their coöperation with law enforcement continues to be useful. (The

third member of their plot, Adis Medunjanin, a Bosnian-American, pleaded not guilty. He was convicted, in 2012, in Brooklyn federal court, and sentenced to life in prison.)

Abid Naseer fought extradition from the U.K. but lost, arriving in Brooklyn in early 2013. Ahmad, preparing to try him, debriefed Zazi and Ahmedzay at length. They had been in Peshawar in November, 2008, when Naseer was also there. The same Al Qaeda "external-operations" team that tasked Zazi and his friends with a martyrdom operation had commanded Naseer. Ahmad planned to call Zazi and Ahmedzay as witnesses. They could fill in the picture of Al Qaeda's training operation in Pakistan from the inside.

The Naseer trial started in February, 2015. David Bitkower, who was Ahmad's supervisor during the first phase, told me that it was a tough case. "It was largely circumstantial," he said. "There was no smoking gun. It was all in the argument. You can easily lose." But Ahmad had gathered significant new evidence. Computer forensics had deepened the analysis of Internet and phone records. Ahmad tied the plots, furthermore, to Al Qaeda's top leadership, through documents seized in Osama bin Laden's hideout in Abbottabad, Pakistan, which had not been seen publicly before. In a letter to bin Laden, written in early 2009, Saleh al-Somali, Al Qaeda's external-operations chief, reported, "We had sent a number of brothers to Britain, Russia, and Europe on condition that their work will be completed and ready before the end of the year." When Mark Smith, the Manchester detective, heard those words, he said, "We knew immediately they were talking about our guys."

Naseer represented himself, and did a credible job, though Judge Raymond J. Dearie warned him not to waste time arguing to the jury that the United States lacked jurisdiction in his case. By Act of Congress, the U.S. has broad jurisdiction to investigate and prosecute terrorism offenses anywhere in the world. Foreign investigations require the permission of the national authorities, of course, but in this case Ahmad and her team had received extensive support from the British. She called Manchester police officers and MI5 agents as witnesses, and they gladly appeared, wearing "light disguise"—wigs, fake beards, makeup—because they were still working undercover. Security for the trial was heavy. Naseer was not allowed to rise from the defense table except when summoned by the Judge; Ahmad and her colleagues were bound by the same rule, lest the jury infer that the defendant was considered unusually dangerous by the court.

"He was a soldier," Ahmad said later, of Naseer. "Totally controlled, ice-cold, well trained. He tried to be charming to witnesses, even smiled at the jury."

Naseer, who is powerfully built, had a bushy beard, and eyes that, at least in photographs, did not look capable of effectively supporting a smile. While acting as his own advocate, he spoke about himself in the third person. There was no "I," only "Naseer."

It was a bizarre case, turning largely on the meaning of a handful of e-mails between Naseer and the handler, who was code-named Sohaib. Naseer contended that the e-mails were innocent banter with a stranger whom he had met in an Internet chat room. He was looking for a wife, discussing his prospects. The prosecution contended that the e-mails were in code, and Ahmad subjected them to a probing read. In e-mails, Naseer and Sohaib agreed that a car would be useful for married life; that meant the plan called for a car bomb, Ahmad said. Sixty-one photographs of a chain store called Next and its surroundings had been saved to a draft e-mail file, which was available to his co-conspirators. This, she said, was where the bomb would be detonated. The photos suggested a second strike: panicked shoppers would stampede into the blast paths of backpack bombs set deeper in the Arndale Centre, which sees seventy thousand people on a busy day.

Naseer's e-mails to Sohaib described a meandering courtship. He wrote that he met Huma, the first object of his affections, at a bus stop, and that he found her "very weak and difficult to convince." She worked in a cosmetics shop. According to Ahmad, "Huma" stood for hydrogen peroxide, a bomb ingredient found in beauty products (the cosmetics shop) in a diluted, or weak, form. Extracting it in sufficiently concentrated form is a challenge—it's

"difficult to convince." Nadia, another woman of interest, was more like it. "Nadia is crystal clear girl, and it won't take long to relate with her," Naseer wrote to Sohaib. "Nadia" was nitrate, Ahmad explained. Ammonium nitrate, a high-order explosive found in some artificial fertilizers, is a white crystal solid in its pure form. (Timothy McVeigh used a fertilizer bomb to kill a hundred and sixty-eight people and injure more than five hundred in Oklahoma City, in 1995.) The ammonium-nitrate detonator that Naseer settled on could be quickly assembled. "These are stilted descriptions of women, but they're pretty good descriptions of bombs," Ahmad told the jury.

Ahmad teased out the absurdity of Naseer's romances. Huma, he wrote, seemed unwell. She had lost weight. This was two days after she first gave him the cold shoulder at the bus stop. "How much weight can somebody possibly lose in two days?" Ahmad asked. "On top of that, it's December in northern England. Huma is not going to be standing at a bus stop in a bikini where you can count her ribs."

Using a precise breakdown of Naseer's browsing history and phone records, Ahmad showed that, on a trip to Pakistan, ostensibly to visit his sick mother, he contacted two of his co-conspirators in Britain, men whom he claimed he barely knew. He then "went dark" for two weeks, during which, Ahmad suggested, he visited the Federally Administered Tribal Areas, the rugged hinterlands along the Afghanistan border where Al Qaeda has its training camps. Ahmad brought Najibullah Zazi to the witness stand to describe for the jury his own training in the camps, where he learned how to handle an AK-47 and how to build bombs. One design—the kind "the guys in London used" in 2005—was wired through the pockets of a specially made shirt. Another, which he preferred, was to be carried in a backpack and wrapped in ball bearings for, as he put it, "the casualty purpose."

Ahmad never mentioned her own familiarity with Pakistan—that her father had gone to university, for instance, in Naseer's home town, Peshawar. But she spoke with authority about how Peshawar had been changed by the American invasion of Afghanistan, and of how many Pashtuns—the region's dominant ethnic group, to which Naseer belongs—had felt humiliated by the occupation, inspiring some young men to join Al Qaeda to seek revenge. Mark Smith, the Manchester detective, who watched the trial, said, "Just the way she pronounced the names of the towns in Pakistan, you knew she wasn't guessing."

Naseer returned to England, still on a student visa. He never went to school. Instead, he spent much of his time online, Instant Messaging and visiting Muslim dating sites. But he never e-mailed his Al Qaeda handler from his personal e-mail address, or even from his own computer. For that, he went to an Internet café, where he habitually used the same public computer, and took care to use his operational accounts only to e-mail his handler. "This is Al Qaeda tradecraft," Ahmad said.

Naseer's last e-mail to Sohaib, sent on April 3, 2009, announced that he would soon be married. "I met with Nadia family and we both parties have agreed to conduct the Nikkah after the 15th and before the 20th of this month . . . you should be ready between those dates." A nikkah is a wedding ceremony. According to Ahmad's minute-by-minute reconstruction of the day, this e-mail was drafted, loaded on a thumb drive, and carried to the Internet café. At his usual terminal, Naseer began listening, on his phone, to a nasheed—a religious or spiritual chant. Ahmad played the nasheed for the jury, and then read a translation from the Arabic: "We are marching towards them. With turbans that will become their burial garments. They spilled their blood generously and with love. Looking forward to death in large numbers." Naseer copied the document from the thumb drive into an e-mail and pressed Send. The attack was on, and Al Qaeda knew enough about its timing and location to prepare to take credit.

Naseer claimed that he didn't realize Sohaib was a terrorist. But, while Zazi was on the stand, Ahmad used his testimony to establish that Naseer's pen pal was the same handler, with the same Yahoo address, who had directed the Zazi team's efforts to bomb New York subway trains.

In her closing remarks, Ahmad told the jury that Naseer's demeanor alone during his testimony showed that he knew Sohaib and also knew that So-

haib was Al Qaeda: “Ask yourself, did anything he said or did, did any look that glanced over his face, suggest any shock or horror or surprise at the fact that his random Internet buddy Sohaib, who he thought was just a fun guy to exaggerate his love life to, was actually a member of Al Qaeda? Did anything he said or did suggest that he hadn’t known that all along? No, I suggest to you that it did not. He didn’t express any shock, any regret, any upsetness, any holy-crapness at the fact that he had just found out in this courtroom that he had been e-mailing Al Qaeda.”

Ahmad’s summation was three and a half hours long. She remembers looking at her notes only once. James McGovern, who was the chief of the Eastern District’s Criminal Division until last year, told me, “It was the summation of a lifetime.” Ahmad had called former Al Qaeda operatives; British secret agents; experts in explosives, computer forensics, Arabic, Pashto, and Al Qaeda’s structure; the F.B.I. agent who secured the bin Laden documents; even a Norwegian detective who could link, through shared e-mail accounts, the Manchester plot with a plot to bomb a Copenhagen newspaper office. Ahmad’s ability to connect with the jury was critical. “You want to project: I am the most reasonable person in the room,” McGovern said. “Zainab excels at that. Jurors believe that they would see eye to eye with her about things. People want to say, ‘That really impressive person, I want to be in agreement with that person.’ ” Ahmad’s proposition about Naseer was simple, in the end: “This man wanted to drive a car bomb into a crowded shopping center and watch people die.” After one day of deliberation, the jury agreed. Naseer was convicted on all counts and, in November, 2015, he was sentenced to forty years.

Last spring, Loretta Lynch, as Attorney General, asked Ahmad to come work at Main Justice. Ahmad took a leave from E.D.N.Y. and moved to Washington, where her brief included transnational organized crime and international affairs. She travelled frequently—not to dusty towns in the Sahara or prisons in Saudi Arabia but to foreign capitals. She briefed senators, represented the Justice Department at the White House, and led a delegation to Trinidad to address the outsized flow of fighters joining isis from there. Supervising about seventy prosecutors, she oversaw critical investigative, charging, and litigation decisions.

Soon after Sessions replaced Lynch, he demanded the immediate resignations of all U.S. Attorneys who remained from the Obama years. Since U.S. Attorneys are the only political appointees in their offices, the work of most career prosecutors went on. But Ahmad, watching the transition from up close, saw a wholesale reorientation of Justice Department priorities. Under Sessions, the themes would be immigration enforcement, a revived federal war on drugs, and the abandonment of initiatives to reduce civil-rights abuses in American police departments. Certainly, extraterritorial terrorism prosecutions would be a nonstarter.

Sessions has repeatedly expressed his desire to see accused terrorists dealt with by military commissions rather than “try them in a normal criminal court.” President Trump has repeatedly declared his enthusiasm for expanding the military prison at Guantánamo, which has not received a new inmate in nine years and presently holds only forty-one prisoners. “We’re gonna load it up with some bad dudes, believe me,” Trump told a campaign rally last year. In February, a draft executive order directing the Pentagon to send captured isis fighters to Guantánamo was leaked to the Times.

It is not yet clear how all these new inmates will be captured. But it is clear that the military commissions at Guantánamo have failed miserably. Since the September 11th attacks, federal criminal courts have convicted more than six hundred people on charges related to international terrorism. The Guantánamo commissions have convicted eight, with three of those convictions vacated or overturned on appeal, and one partially overturned. More prisoners have died in the camp than have been convicted there.

Many successful terrorism prosecutions in recent years, moreover, have followed extraditions that would not have occurred if Guantánamo and its military commissions had remained an option. Abid Naseer and dozens of other convicted terrorists now serving U.S. prison sentences would instead be free—still on the battlefield, as it is said—because our main counterterrorism partners, including the

United Kingdom, Canada, Germany, and the Netherlands, refuse to provide evidence or to coöperate with extradition requests unless a suspect is to be tried in a criminal court.

But the Trump Administration seems less interested, so far, in parrying threats than in demonizing Muslims, particularly immigrants and refugees. Besides everything else, this is a strategic mistake. As Ahmad says, "America is the most successful country in the world at integrating immigrants, and that helps keep us safe. Immigrant communities in Europe are much more ghettoized, much less warmly accepted. We do have a problem with people trying to join isis, but the number of people going from Belgium dwarfs the number going from here, even in absolute terms, let alone relative to our populations."

The "threat stream" emanating from Islamist extremism has not abated. Al Qaeda branches continue to wreak havoc in the Arabian Peninsula, North Africa, West Africa, and Syria. Boko Haram's depredations ravage much of West Africa, Al Shabaab thrives in the Horn of Africa, and the Taliban is steadily regaining ground in Afghanistan. But, at the moment, none of these movements expend much energy on staging attacks in the West. The Islamic State is another story. Its online appeals to sympathizers in the Dar Al-Kufr—the territory of disbelief—continue to find vulnerable, disturbed individuals prepared to act. "It's so hard to combat, especially with the rise of encrypted communications," Ahmad said. "We can take down networks, but only if there are networks."

Ahmad returned to E.D.N.Y. in April. She and her colleagues remain deep in debate over what to do with jihadists returning from the battlefields of Syria and Iraq. "When should we prosecute? Material support for ISIS is a crime, but can we make good cases? Can these guys be rehabilitated? How useful is their intel? If they're not in custody, what level of surveillance?"

The success of U.S. federal prosecutors in rolling up terrorist networks is not widely appreciated. The leadership of core Al Qaeda has, by all accounts, been decimated. Drone strikes have been important to that progress, but their success, and the fact that civilian casualties have not been even more extensive, is entirely due to good intelligence, most of it provided by informants. Ahmad thinks that popular culture tends to misunderstand the process, and the limited utility of drone strikes. 'Zero Dark Thirty' got a crucial point wrong," she told me. "It wasn't stopping torture that stopped intel. It was stopping interrogation. It was going to droning, to killing. You get no intel from corpses."

Currently, Ahmad has two terrorism defendants in custody awaiting trial. One is the Iraqi-Canadian whom the Canadians took four years to transfer to the U.S. The other is Mohanad Mahmoud al-Farekh, the Texan who was captured in Pakistan while a debate raged in Washington over targeting him with a drone strike. (This list does not include, of course, suspects whose indictments are under seal, some of whom may already be in custody and cooperating.) Ahmad told me that she may hand over these two defendants to another prosecutor. She wouldn't do so if they were difficult cases to make—that would be bad form—but the evidence in both is very strong.

A federal prosecutor who has worked with Ahmad, and who declined to be named, acknowledged the risk of extending the protections of the U.S. legal system to accused jihadists. "If you bring a member of Al Qaeda here from Mali or Nigeria and that person is acquitted, they'll probably file an asylum claim or a Convention Against Torture claim, saying Al Qaeda or the government back home is going to hurt them. And, the next thing you know, you're standing next to that person in Starbucks."

Ahmad pondered that image for a long minute. Finally, she said, "I think we're safer even if the guy ends up next to you at Starbucks. I'll take that as a cost of doing business when we're putting incredibly dangerous people in jail from more successful cases. Also, if he's done time here and then is released and stays, he'll be under surveillance. But that has not happened. Not once." ♦

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر (ربوہ) کی نئی عمارت کے چند مناظر

پروفیسر ضیاء الحسن شاہ۔ پرنسپل گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر (ربوہ)

WELCOME

GOVT. POST GRADUATE, T.I. COLLEGE

B.A B.Sc.

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج

چناب نگر

رجسٹریشن اور کوچنگ کلاسز کا باقاعدہ آغاز

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر

پرنسپل صاحبان

نمبر شمار	نام	از	تا
1	پروفیسر محمد علی چودھری	1-9-72	17-11-76
2	پروفیسر محمد یعقوب چودھری	18-11-76	5-7-78
3	پروفیسر محمد فرمان چودھری	6-7-78	15-9-78
4	ڈاکٹر این۔ اے خان	6-12-78	20-4-79
5	پروفیسر ایس۔ اے حامد	21-4-79	26-5-79
6	پروفیسر منظور حسین مرزا	27-5-79	11-8-79
7	پروفیسر محمد بخش ملک	12-9-79	26-1-86
8	ڈاکٹر مظفر عباس	29-1-86	27-12-87
9	ڈاکٹر مبارک علی	7-1-88	3-4-90
10	ایم۔ اے مسعود چودھری	14-4-90	17-8-96
11	پروفیسر حاجی مقبول احمد خان	18-8-96	14-8-07
12	چودھری محمد انور جاوید	15-8-07	3-7-08
13	پروفیسر جہانگیر احمد چودھری	4-7-08	25-5-15
14	سید قاسم علی شاہ	25-5-15	11-3-16
15	پروفیسر ضیاء الحسین شاہ	12-3-16	
16			
17			
18			
19			
20			
21			
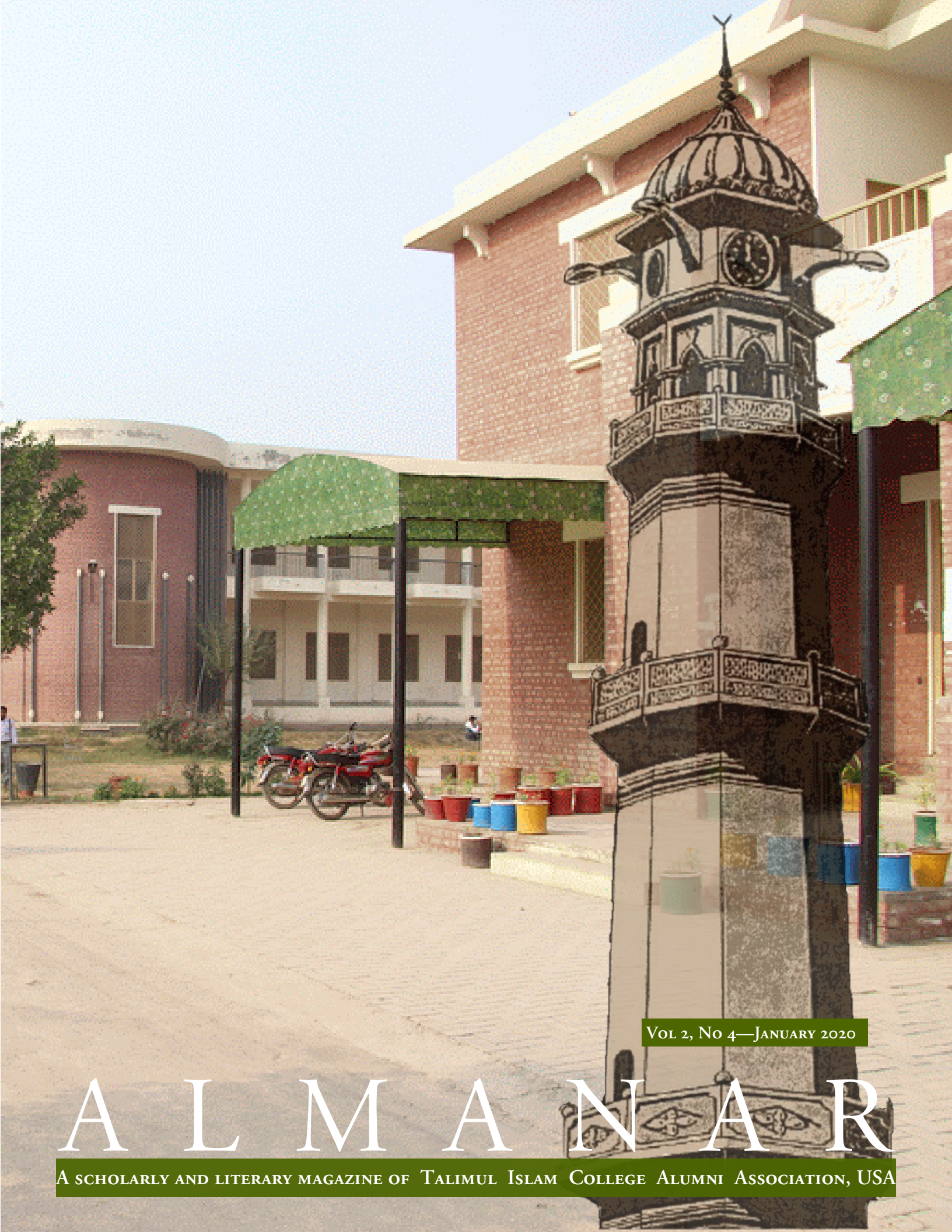
Vol 2, No 4—January 2020
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA